جدوجہدوعمل۔۔۔قومی بیداری کیلئے!!!

ماہنامہ

آزاد

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

دسمبر:2012 | شمارہ نمبر:5 | جلدنمبر:1

فہرست

اداریہ		02
قومی تحریک میں بلوچ خواتین کو کیا کردار ادا کرنی چاہیئے ۔۔؟	بانک کریمہ بلوچ	03
اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کا جائزہ اجلاس	بجار بلوچ	06
افغان مسئلہ! امریکہ وروس کیلئے لمحہ فکریہ	حفیظ حسن آبادی	09
کوریا غلامی اور آزادی کی کٹھن راہ پر	زرین فاطمہ	12
قندیل	بانک کریمہ بلوچ	22
چیئرمین گونزبلو	جوان بلوچ	24
پختون بچی پر حملہ، ایجنسیوں کی کارستانی!	علی شیر	34
سیکولرازم تاریخی پس منظر میں	حمل بلوچ	39
آئیڈیالوجی	ریمنڈ ولیمز	49
اختر مینگل! سامراج کا اگلا مہرہ	زرمینہ گل	51
اسلام اور پاکستان	شیہک بلوچ	54
میرے وطن کی رونقیں بحال کردو	روبینہ بلوچ	56
انقلاب اور جنگ	برمش بلوچ	58
جنگ آزادی میں ہی قومی نجات ہے۔۔ پمفلٹ	ادارہ	60
آئینہِ حقائق	قائم خان بلوچ	61
اخباری بیانات	ادارہ	64

www.sagaar.org Blog : azadmagazine.blogspot.com E-mail : azadmagazine@gmail.com

اداریہ

شکست خوردہ دشمن کے نئے حربے نئی چالیں

تحریک آزادی میں تسلسل اور کامیاب حکمت عملیوں سے پاکستانی حربے ناکامی کا شکار ہورہے ہیں جسے دیکھتے ہوئے اپنی شکست سے خوفزدہ ہوکر آزادی کی تحریک کو مختصر مدت میں ختم کرنے کیلئے پاکستان بیک وقت اپنے بیشتر حکمت عملیاں آزمانے پر مجبو ہو چکا ہے لیکن تضادات سے پر پاکستان کی حکمت عملیاں ناکامیوں کا شکار ہورہی ہیں۔ پاکستان بلوچ آزادی پسندوں کے اغوا اور مسخ شدہ لاشیں پھینکنے، آزادی پسندوں کا ٹارگٹ کلنگ کرنے، آبادیوں پر بمباری اور سرچ آپریشن کے زریعے ایک جانب بلوچ قوم میں آزادی کی مضبوط جدوجہد کو کمزور کرنے کی کوششیں کررہا ہے تو دوسری جانب بلوچ قوم پرستی کے نام پر پاکستانی گماشتگی کرنے والے سیاستدان تحریک آزادی کے خلاف سرگرم ہیں اور پاکستان سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے بلوچ فرزندوں کو شہید کروانے، تحریک آزادی کو سیاسی میدان میں کمزور کرنے، عوام اور آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والے تنظیموں اور جہدکاروں کے درمیان فاصلے پیدا کرنے، آبادیوں پر بمباری اور آپریشن میں معاونت اور رہنمائی کرنے میں پیش پیش ہیں لیکن اپنے حربوں کی ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے پاکستانی گماشتے ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہوئے خود کو بے نقاب کررہے ہیں اگرچہ الیکشن کے نام پر سیاست کرنے والے گماشتہ سیاستدان اور ڈیتھ اسکوڈز اپنی وفاداری نبانے اور بلوچ نسل کشی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جارہے ہیں لیکن اپنی حکمت عملیوں کی ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے مفادات کی تحفظ میں اپنے ہی حربوں کو بے نقاب کررہے ہیں۔

ایک جانب بلوچستان بھر میں اور خاص طور پر خضدار میں شفیق مینگل کی سربراہی میں بلوچ فرزندوں کا قتل عام کیا جارہا ہے تو دوسری جانب شفیق مینگل کے مخالف لیکن پاکستان کے وفادار سردار اختر مینگل کو بھی بطور ہتھیار تحریک آزادی کے خلاف استعمال کرنے کیلئے میدان میں لایا جاچکا ہے جبکہ اختر مینگل اپنا راستہ صاف کرنے کیلئے پاکستان کی جانب سے شفیق مینگل کی سرپرستی اور اسے قتل عام کی کھلی چھوٹ دینے کو منظر عام پر لیکر آئے جبکہ اختر مینگل خود ہی اسی پاکستان کی تعاون کیلئے پرتول رہے ہیں جو کہ اب تک شفیق مینگل اور سراج رہیسانی کی سرپرستی میں ڈیتھ اسکواڈ چلا رہے ہیں۔ بلوچستان میں پاکستان کی شکست کو دیکھتے ہوئے اختر مینگل اور ان جیسے گماشتہ سیاستدانوں کو بلوچستان میں اپنی حقیقت آشکار ہوتی دکھائی دے رہی ہے جبکہ وہ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ بلوچ عوام ہزاروں کی تعداد میں قربانیوں دینے اور تشدد و جبر کا سامنہ کرنے کے بعد اب پاکستان کے مراعات اور نوکریوں کے جھانسے میں نہیں آئے گی جس سے انہیں اپنی ساخت کا خاتمہ نظر آرہا ہے۔ بلوچستان میں ایف سی، ائی ایس آئی، ایم آئی، اور سراج رئیسانی، شفیق مینگل کی ڈیتھ اسکواڈ کے ہاتھوں بلوچ فرزندوں کو شہید کرنے کی حکمت عملیوں کے سامنے بلوچ قومی تحریک آزادی کی عوامی مقبولیت اور عالمی سطح پر تحریک آزادی سے ہمدردی، پاکستان پر تنقیدوں سے بلوچستان میں پاکستانی فوج اور گماشتوں کیلئے زمین تنگ ہوچکی ہے جس کی وجہ سے اب پاکستان اپنی پہلے سے جاری حربوں کو تنقیدوں کا سامنا ہونے کے باوجود اور پاکستانی میڈیا اور سول سوسائٹی کے بلوچ قوم کے ساتھ جعلی ہمدردیوں اور پاکستان کی بقا کیلئے بلوچستان میں حکمت عملیاں تبدیل کرنے کے مطالبوں کے باوجود اپنے ناکام حربوں کو جاری رکھے ہوئے ہے اور پہلے سے جاری گمشدگیوں میں روز بروز شدت لائی جارہی ہے آئے روز بلوچ فرزندوں کو لاپتہ کیا جارہا ہے جبکہ ڈیتھ اسکواڈ شدت کے ساتھ لوگوں کو ٹارگٹ کرنے میں مصروف ہیں جبکہ بلوچستان بھر میں جرائم پیشہ کاروائیوں کے ذریعے ایک انتشار کی صورت پیدا کرنے کی پھرپور کوشش کی جارہی ہے جبکہ ایف سی بلوچ آبادیوں کے خلاف سرچ آپریشن اور گرفتاریوں میں مصروف ہے لیکن اب ان حربوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی الیکشن کو ممکن بنانے کیلئے بی این پی مینگل، بی این پی عوامی، نیشنل پارٹی اور ان کے سرکردہ گماشتوں اختر مینگل، حاصل بیزنجو، ڈاکٹر مالک جسے کرداروں کو تحریک آزادی کی کامیابیوں کے سامنے پاکستانی قبضہ گیریت کے شکست کو روکنے کیلئے ٹاسک دیکر ان کی وفاداری کو آزمایا جارہا ہے اس سے قبل اس وقت جب بلوچ قوم پارلیمنٹ اور عدلیہ سمیت پاکستانی اداروں کو مسترد کرکے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے عالمی دنیا سے مداخلت کی اپیل کررہی تھی تو اختر مینگل کو میدان میں لاکر پاکستانی عدلیہ میں اپنے مطالبوں کے ذریعے بلوچستان میں اپنی وجود کھوچکے پاکستان عدلیہ اور اداروں کو زندہ رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی اور اب سینٹ کی کمیٹی کے نام پر حاصل بیزنجو کو تحریک آزادی کو کمزور کرنے کیلئے میدان میں لاکر ٹاسک دیا گیا ہے جبکہ اس کام میں شفیق مینگل سراج رہیسانی سمیت حاصل بیزنجو اور ان کے ہمنوا سب ایک ہی ایجنڈے بلوچ قومی نسل کشی اور تحریک آزادی کو کمزور کرنے کے تحت میدان میں سرگرم عمل ہیں لیکن اپنی مفادات کے بقاء کیلئے اب حاصل بیزنجو اور ان جیسے سیاستدان سراج رہیسانی اور شفیق مینگل کو تنقید کا نشانہ رہے ہیں جس سے ان کے اندرونی تضادات اور ان کی حکمت عملیوں کی ناکامیاں واضح ہورہی ہیں اور اپنی ناکام حکمت عملیوں اور تحریک آزادی کے سامنے اپنی شکست کو چھپانے کیلئے اپنے ہی ہمنواوں کے خلاف تنقید کررہے ہیں۔ پاکستان کی حکمت عملیاں اگرچہ روز بروز شدید تر ہوتی جارہی ہیں اور ان میں مزید درندگی آتی جارہی ہے لیکن بلوچ قومی تحریک آزادی کے تسلسل اور بلوچ عوام کی آزادی کے مقصد پر مستحکم وابستگی اور قومی آزادی کے شہیدوں اور جہدکاروں کی جدوجہد اور قربانیوں کو اپنا نصب العین بنالینے سے پاکستانی ادارے ان کے گماشتے اور ان کی قبضہ گیر فوج کی حقیقت بلوچ قوم کے سامنے واضع ہوچکی ہے پاکستان کی جانب سے کوئی بھی حکمت عملی بلوچ قوم کو قومی تحریک آزادی کے تاریخی جدوجہد سے دور نہیں کرسکتا اور نہ ہی پاکستانی پارلیمانی انتخابات کسی صورت ممکن ہوسکتے ہیں۔

قومی تحریک میں بلوچ خواتین کو کیا کردار ادا کرنی چاہیئے۔۔؟

بانک کریمہ بلوچ

عظیم مفکروں کا کہنا ہے کہ جو قوم مرنے کی فن سے آشنا ہو جائے اسے کوئی طاقت غلام نہیں بنا سکتی۔طویل غلامی کے بعد بلوچ قومی تحریک قربانیوں کی لازوال تاریخ رقم کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی ہے۔بلوچ اپنی غلامی کا شدت سے احساس کر چکا ہے، بلوچ سرزمین سے اس لئے محبت نہیں کرتا کہ وہ معدنیات سے مالا مال ہے بلکہ سرزمین سے ہماری محبت فطری جذبہ ہے اور یہی جذبہ مر مٹنے کا حوصلہ دیتا ہے، جان سے گزر جانے کا درس دیتا ہے۔

بلوچ دشمنوں اور بلوچ پارلیمنٹیرین نے ہمیشہ الفاظ کے ہیر پھیر کے ذریعے بلوچ مسئلہ کو الجھانے کی کوشش کی ہے۔کبھی اسے سیاسی ،کبھی معاشی اور کبھی آئینی کہا گیا۔کبھی 1940 کی لاہور کی قرارداد کا رٹا لگایا گیا۔ہر دور میں مختلف سیاسی اصطلاحات ،حق حاکمیت ،حق خودارادیت ،حق ساحل وَسائل ،صوبائی خودمختاری ،حق ملکیت جیسے اصطلاحات کے ذریعے بلوچ قومی غلامی کو چھپا کر دیدہ دانستہ اور شعوری طور پر بلوچ عوام کو قومی آزادی کی جدوجہد سے دور رکھنے کی محلاتی سازش کی گئی۔لیکن قومی تحریک نے واضح کر دیا کہ بلوچ مسئلہ قومی غلامی ہے اور اسکا حل غلامی سے نجات ہے، بلوچ اقتدار اعلی اور بلوچ ریاست کی بحالی ہے۔قومی غلامی کے خاتمے کی جدوجہد میں مرد،عورت ، جوان اور بوڑھے شریک عمل ہیں۔تابوت میں بند لاشوں سے لیکر مسخ لاشوں تک ،ٹارچر سیلوں سے لیکر کال کوٹریوں تک قومی آزادی کا یہ عظیم سفر جاری ہے اور اسکی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بلوچ قومی تحریک میں بلوچ خواتین کی شمولیت جہاں تحریک کے لیئے انتہائی مفید ہے وہاں قابض قوتوں کے لیئے ایک دردسر بھی ہے۔قومی تحریک میں روز اول سے بلوچ خواتین نے انتہائی فعال اور منظم انداز میں اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ اس جدوجہد کو آگے بڑھایا۔بلوچ خواتین پینل یا بی ایس او آزاد، یا بلوچ نیشنل فرنٹ کے پلیٹ فارم سے خواتین نے قدم قدم قومی تحریک آزادی کو آگے بڑھایا۔بلوچ قومی تحریک نے بلوچ خواتین کو بانڑی کا کردار دلا کر اسکے قومی وسیاسی شعور کو پختگی دی ہے۔بلوچ خواتین نے شروع دن سے سیاسی محاذ گرم کر رکھا ہے۔جلسہ جلوس ،ریلیاں ،بھوک ہڑتالی کیمپ اور سیمینار وغیرہ کے ذریعے خواتین سائنسی انداز میں اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار بخوبی نبھا رہی ہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قومی تحریک اور زیادہ مظبوط ہوگئی اور اسی طرح قربانیوں کو اور زیادہ ضرورت پڑے گی۔

تمام بلوچ شہداء کے ماؤں نے اپنی لخت جگر کی شہادت پر جس عزم و ہمت کا اظہار کیا ہے اس نے قومی تحریک کے سپاہیوں کے جذبے کو حوصلہ عطاء کیا ہے جو کہ قومی تحریک میں خواتین کے مظبوط کردار کو ظاہر کرتی ہے۔

ہم ایک خونخوار درندے سے روشن صبح چھیننے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔رات کی تاریکی میں طلوع آفتاب کی کوششوں کا حصہ ہے،قومی تحریک میں خواتین کا بہترین کرداران کی ہمت اور جہد مسلسل ہے۔

قومی جنگ آزادی میں خواتین کے کردار سے پہلے جنگ کو سمجھنے کے لیئے بزرگ انقلابی رہبر ماؤزے تنگ کے اس قول پر غور کریں۔

’’مطالعہ حصول علم ہوتا ہے لیکن اخلاق بھی حصول علم ہوتا ہے بلکہ حصول علم اہم ترقسم ہوتا ہے، ہمارا اہم طریقہ جنگ سیکھنا ہے جس شخص کو اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں وہ بھی جنگ سیکھتا ہے وہ جنگ میں حصہ لیکر جنگ سیکھ سکتا ہے،انقلابی جنگ ایک عوامی ذمہ داری ہوتی ہے، بیشتر حالات میں یہ معاملہ یوں نہیں ہوتا کہ پہلے سیکھا جائے اور پھر عمل کیا جائے بلکہ پہلے عمل کیا جاتا ہے پھر سیکھا جاتا ہے کیونکہ عمل بذات خود حصول علم کا دوسرا نام ہے‘‘۔

جنگیں عموما دوقسموں کی لڑی جاتی ہیں۔ایک ہوتا ہے منصفانہ اور دوسرا غیر منصفانہ،ایک طبقہ کے لیے جو جنگ منصفانہ ہے تو دوسرے طبقے کے لیے غیر منصفانہ ہے کیونکہ جس نے آپ کے حقوق غصب کئے ہیں اور ان پر اپنا حق جتاتا ہے تو جب آپ حقوق کے لیے جنگ کرتے ہیں تو وہ جنگ آپ کے لئے منصفانہ اور غاصب کے لئے غیر منصفانہ ہے ۔اسی طرح موجودہ دور میں دہشت گردی کی ایک اصطلاح ہے کوئی بھی ابھی تک یہ یقین نہیں کر سکا کہ

اصل دہشت گرد کون ہے، افغان عوام یا نیٹو فورسز، عراقی عوام یا امریکی فورسز ، پاکستانی فوج یا بلوچ عوام۔

جنگ ہمیشہ عوام پر مسلط کیا جاتا ہے وہ اس طرح کہ جب کسی قوم کی سرزمین پر کوئی ظالم آکر قبضہ کرتا ہے اور اس قوم کا سب کچھ لوٹ کر اپنے ملک بھیج دیتا ہے اس قوم کو نان شبینہ کا محتاج بنا دیتا ہے اور اسکی زبان، تاریخ، ثقافت، رسوم و رواج و تہذیب کو پوری طرح مسخ کر کے آہستہ آہستہ اسے ختم کرنے کا منصوبہ بناتا ہے تو یقیناً مظلوم قوم ایک نہ ایک دن اٹھ کر اپنے دشمن کا پہچان کر کے اسے جنگ پر آمادہ کر لیتا ہے اور اس جنگ میں دھیرے دھیرے کر کے پوری قوم شامل ہو جاتی ہے اور اس میں پھر سب کرداروں کا تعین ہوتا ہے، جب جنگ قومی بن جاتی ہے اور اس میں قومی بقاء کا سوال ہو تو ہر ایک اپنی بساط کے مطابق اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ایک خالص کردار ہوتا ہے۔

انقلاب چین کے بعد جب وہاں کچھ امریکی طالبات آئے ہوئے اور انکی ملاقات چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری چواین لائی سے ہوئی کیونکہ ان طالبات کا تعلق امریکی کمیونسٹ پارٹی سے تھا تو انہوں نے کہا کہ ہم بھی چینی عورتوں کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں۔ کامریڈ چواین لائی نے انہیں کہا کہ شاید آپ لوگ کر سکیں مگر آپ میں اور چینی عورتوں میں بہت فرق ہے ایک طبقاتی اور دوسرا ہم ایک خونی انقلاب کے مرحلے سے گزر چکے ہیں اور یہاں کے بیشتر عورتوں نے مردوں کی شانہ بشانہ جنگیں لڑی ہیں اور انہوں نے مردوں کی طرح بال بھی منڈوائی ہیں اور چین ایک جاگیردارانہ اور نیم غلامانہ دور میں شامل ہو چکا تھا اور ساتھ ہی جاپانی سامراجی قوت سے مقابلہ تھا۔

جب ہم قومی جنگ کو ایک ایسے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ جو قبائلی زندگی گزار رہا ہو اور عورت چادر و چار دیواری کی عزت ہو اور عورت کا نام بھی غیر مرد کے سامنے لینا گناہ سے کم تر نہ ہو، عورت کا غیر مرد کے ساتھ بات کرنا بہت بڑا عیب ہو تو ایسے سماج میں عورت کے کردار کا تعین کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے اور اس میں بجائے فائدے کے نقصانات بہت زیادہ ہونگے۔

جہاں مولویوں کا بول بالا ہو اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں عورت کو نازک اندام اور گھر کی زینت بنانے پر تلے ہوئے ہوں۔ ایسے معاشرے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قومی جنگیں ہمیشہ مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ عورتوں کو مردوں کی طرح اس بات پر آمادہ کر لینا چاہیے کہ واقعی ہم غلام ہیں اور وہ غلاموں کے غلام ہیں۔ سب سے پہلے احساس غلامی کو اجاگر کرنا چاہیے کہ کس طرح ہماری ہزار سالہ قدیم سرزمین بلوچستان پر فوج کشی کر کے بندوق کے زور پر ہمیں غلام بنایا گیا ہے۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ سیاسی تربیت ہونا لازمی ہے، کوئی شخص جب تک اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ وہ دوسری جابر قوم کا غلام ہے تو وہ اپنی غلامی کے خلاف کچھ کرنے پر کیسے اٹھ کھڑا ہو سکے گا۔؟ سیاسی تربیت کے بغیر کوئی بھی تحریک منزل نہیں پا سکتی۔ جنگی پروپیگنڈہ کا کام عورتیں بہت بہتر انداز میں کر سکتی ہے۔ دودا اور کبر کی ماں کا اور داد شاہ کی بہن کا کردار ادا کر سکتی ہیں۔

دنیا میں جتنی قومی جنگیں لڑی گئی ہیں اور لڑی جا رہی ہیں اس میں عورتوں نے ایک مخصوص کردار ادا کیا ہے۔ فلسطین کی جنگ آزادی ہو یا چیچن جنگ ہو سب میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ ہیں مگر ہر معاشرے کی کچھ روایات اور کچھ پاسداریاں ہوتی ہیں۔

جنگیں ہر قسم کی طبقاتی سماج میں لڑی جا سکتی ہیں اور اس میں عورتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم مطالعہ کریں اسلام کا تو جنگ جمل میں ام الامت بی بی عائشہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

ایک غلامانہ معاشرے میں کہیں بھی عورتیں کم درجہ نہیں ہو سکتیں وہ بندوق چلا سکتی ہیں، انقلاب کے ہر شعبے میں مردوں سے پیچھے نہیں ہوتی ہیں مگر اس کردار کو نبھانے کے لئے عورتوں کے لئے انقلابی پارٹی اور طالبات کے لئے انقلابی تنظیم کا ہونا ضروری ہے اور اس پارٹی کی مثبت سوچ ہو اور معاشرے میں مثبت کردار ہو اور وہ مکمل طور پر عوامی ہو، اسکی سوچ اور فکر عوام سے وابستہ ہو۔

عورتیں اپنی لئے الگ کمیون بنا سکتی ہیں، الگ سرکل لگا سکتی ہیں۔ اسکولوں میں عورتیں ٹیچرز ہیں وہ اپنی طالبات کو صحیح قومی و انقلابی تربیت دے سکتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ بلوچ عورتیں قومی تحریک کے سیاسی و مسلح محاذ میں عملی کردار کے طور پر آزادی کی تحریک میں عملاً شامل ہو۔ طالبات اپنی اسکولوں

میں پمفلٹ شائع کریں، پوسٹر لگائیں ،شہیدوں کی تصاویر لگائیں اور اپنی سکولوں میں سیاسی بحث و مباحثہ کا آغاز کریں۔ یقیناً یہ کام سخت ہے ۔استانیوں اور دوسری طالبات (جو آپکی ذہنیت کی ہم فکر نہیں ہیں) کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑیگا۔مگر دھیرے دھیرے ان کا لہجہ نرم پڑھ جائیگا اور وہ آپکے موقف کی حمایت کرینگے۔ابتداء میں آپکا کاروان چھوٹا ہوگا۔ پھر قافلہ بن جائیگا اور پھر اپنی سہیلیوں کو انقلابی کتب فراہم کریں۔اپنے گھروں میں اپنے بھائیوں والدین اور سہیلیوں کے ہاں آزادی وغلامی کے مسئلے پر بحث کریں۔اسی طرح عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں اپنے بھائیوں اور شوہر سے سیاسی بحث کریں۔گھروں میں کتابیں پڑھیں جو سیکھتے ہیں پھر اپنے ہمسایوں اور دیگر رشتہ دار خواتین کو سکھائیں انہیں غلامی کا احساس دیں اور غلاموں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان ذمہ داریوں کا احساس دیں اپنے علاقوں کے قریب گرلز سکولوں میں جا کر استانیوں اور طالبات کو بلوچستان کے حالات اور پاکستان کی بلوچ دشمن تعلیمی و معاشی استحصالی سے آگاہ کریں۔جو تعلیم یافتہ ہیں انہیں چاہیے کہ باقی دنیا کے کامیاب و ناکام تحریکوں کی مطالعہ کریں اور انکی مثبت اور منفی، ناکام اور کامیاب تجربات سے سیکھیں کیونکہ کوئی بھی قوم جنگ سیکھنے اور سکھانے کے عمل سے گزرے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔یوں تو اس بات کو ہضم کر لینا چاہیے کہ عوتوں کو قومی دھارے میں شامل کیئے بغیر قومی جنگ نہیں جیتی جا سکتی جس طرح غزوات میں عورتوں نے زخمیوں کو پانی پلایا ہے اسی طرح جب کسی قومی تحریک کے اپنے ہسپتال ہونگے تو انہیں عورتیں بہتر طور پر سنبھال سکتی ہیں پیغام رسانی کا کام کر سکتی ہیں۔

آج کل دشمن سیاسی میدان میں بلوچ خواتین کے کردار سے بہت خوفزدہ ہے اس وجہ سے خواتیں کو مزاحمت کاروں کے خلاف کرنے کے لئے وہ مختلف حربوں کو آزما کر بلوچ مزاحمت کاروں پر تہمات عائد کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے تو دوسری طرف دشمن کی سیاست کرنے والے پاکستانی پارلیمنٹ میں بیٹھے پارٹیاں نوٹ و ووٹ کی سیاست میں خواتین کو ووٹر بنا کر استعمال کر رہی ہیں۔لیکن خواتین کو یہ بات اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پارٹیاں جو ریاست کہ پارلیمنٹ میں بیٹھی ہیں وہ بلوچ آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچا رہی ہیں بلوچ خواتین ایسے پارٹیوں کا بائیکاٹ کر کے ان کے ووٹرز بننے سے انکار کریں تو یہ کردار اپنے آپ میں بہت بڑا ہوگا جو بلوچ قومی سوال کو فائدہ پہنچائیگا۔بلوچ خواتین اس علم کو پانے میں کوشاں رہیں جو علم انہیں صیح اور غلط کے درمیان فرق کو جاننے میں مدد دیں تا کہ کسی ماں کا بیٹا، کسی بہن کا بھائی، کسی عورت کا شوہر بھی غلط راستے پر ہو تو وہ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چل کر بلوچ کاز کو نقصان پہنچانے جیسے عمل میں حصہ دار نہ بنے۔خواتین آزادی کی جنگ میں شامل ہونے کیلیے ماؤزے تنگ کے اس قول پر ضرور غور و فکر کریں کہ؛علم ایک ایسا سائنس ہے اور اس میں کسی قسم کی بد دیانتی اور غرور کی گنجائش نہیں:۔اگر آپ بلوچ خواتین علم چاہتی ہیں تو آپکو حقیقت تبدیل کرنے کے عمل میں حصہ لینا ہوگا۔

کیونکہ اگر آپ ایٹم کی ساخت اور اسکے خواص جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو ایٹم کی حالت تبدیل کرنے کے لئے طبعی و کیمیائی تجربات کرنے ہونگے۔اگر آپ انقلاب کا نظریہ اور طریقہ جاننا چاہتے ہیں تو آپ کو انقلاب میں حصہ لینا ہوگا۔

اپنے انقلاب کو عملی جامہ پہنانے میں ہمیں کسی طرح بھی دوسروں پر انحصار کرنے کا خیال تک نہیں کرنا چاہیئے۔ہمارا انقلاب بہرصورت ہماری اپنی کوششوں سے انجام پانا چاہیئے۔

کامریڈ کم ال سنگ

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کاجائزہ اجلاس

مقبوضہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اظہار تشویش

بجار بلوچ

روان سال کیلئے تنظیم اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کا سالانہ جائزہ اجلاس اکتوبر/نومبر 2012ء میں جنیوا میں منعقد ہوا۔ اطلاعات کے مطابق اس اجلاس میں اقوام متحدہ کے 192 رکن ممالک میں سے اس بار 48 ممالک میں انسانی حقوق کی صورتحال کا جائزہ لیا گیا۔ جن 48 ممالک میں انسانی حقوق کی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ان میں پاکستان بھی شامل ہے پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال پر بحث کرتے ہوئے امریکی مندوب نے مقبوضہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں پر تشویش کا اظہار کیا اور اجلاس کو بتایا کہ بلوچستان (مقبوضہ) میں پاکستانی سکیورٹی دستے ''مارو اور پھینک دو'' کی پالیسی کے تحت شہری حقوق کے حامیوں، بلوچ کارکنوں، ان کے اہل خانہ، صحافیوں، سیاسی کارکنوں اور طالب علم رہنماؤں کو نشانہ بنا رہے ہیں جس کے باعث بلوچ سماج منتشر ہو رہا ہے اور اعتدال پسندی کیلئے مواقع سکڑتے جا رہے ہیں۔ امریکی مندوب نے مطالبہ کیا کہ بلوچستان میں مخالفین کو بزور طاقت خاموش کرنے کی کارروائی روکی جائے اور قومی سطح پر تشدد، شہریوں کو جبری طور پر غائب کرنے اور ماورائے عدالت ہلاکتوں کے ذمہ داروں کو کٹہرے میں لایا جائے۔ امریکی مندوب نے احمدیوں، عیسائیوں اور شیعوں پر بڑھتے ہوئے حملوں اور ان کی چھان بین میں تساہل پر بھی تشویش ظاہر کی۔ پاکستانی وزیر خارجہ حنا ربانی کھر نے اپنے خطاب میں مقبوضہ بلوچستان کا براہ راست ذکر نہیں کیا تاہم اجلاس میں شریک مندوبین کو گمراہ کرنے کیلئے یہ جھوٹا دعویٰ کیا کہ قانون نافظ کرنے والے ادارے شدت پسندی سے نمٹنے کی کارروائیوں میں بین الاقوامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے انسانی حقوق کے احترام اور پیشہ ورانہ معیارات پر کاربند ہیں۔ اس نے مذید یہ جھوٹا دعویٰ بھی کیا کہ سکیورٹی اداروں کے افسروں کے خلاف شکایات کو متعلقہ ادارے، پارلیمنٹ اور عدلیہ سنجیدگی سے لے رہے ہیں تاہم حنا ربانی کھر نے ''مارو اور پھینک دو'' کی پالیسی کے تحت سینکڑوں محبّ وطن بلوچ فرزندوں کی تشدد سے مسخ شدہ لاشیں پھینکنے اور ہزاروں بلوچ فرزندوں کو جبری اغواء اور خفیہ ریاستی عقوبت خانوں میں لاپتہ کرنے کے ذمہ دار پاکستانی فوج، ایم آئی، آئی ایس آئی اور ایف سی کے کسی ایک اہلکار یا آئی ایس آئی و ایم آئی کی بنائی ہوئی ڈیتھ اسکواڈز کے کسی ایک کارندہ کے خلاف مذکورہ اداروں، ربڑاسٹمپ پارلیمنٹ اور متعصب عدلیہ کی کسی بھی کارروائی کی نشاندہی نہ کرسکی۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچ نسل کشی کا ذمہ دار محض کوئی ایک ادارہ نہیں ہے بلکہ اس میں پورا پاکستانی ریاست ملوث ہے کیونکہ بلوچ قوم کا تضاد و مخاصمت محض حکومتِ وقت یا کسی ایک حکومتی ادرے کے ساتھ نہیں بلکہ پاکستان کے ساتھ بحیثیت ریاست ہے اسلئے پاکستانی ریاست کا پورا بالائی ڈھانچہ یعنی مقنّنہ /مجلس قانون ساز Legislature، عدلیہ Judiciary، عاملہ Executive اور ذرائع ابلاغ Media بلوچ نسل کش پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر عملدرآمد کے معاملے میں متفق و یکجا اور ایک دوسرے کے معاون ہیں حتیٰ کہ پاکستان کی نام نہاد سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی بلوچ قومی آزادی کے فطری حق کی حمایت سے نہ صرف گریزاں ہیں بلکہ قابض پاکستانی نوآبادکاروں کے خلاف بلوچوں کے فطری غصہ و نفرت اور ریاستی خفیہ اداروں کی آلہ کاروں کے خلاف بلوچ سرمچاروں کی کارروائیوں کو بنیاد بنا کر بلوچ قومی تحریک آزادی کو عالمی سطح پر بدنام و کمزور کرنے کی کوششوں میں ہر وقت لگے رہتے ہیں بلوچ نسل کُش پالیسیوں اور کارروائیوں کے معاملے میں پاکستانی ریاستی ستونوں Pillars کے درمیان ایکتا Unity اور اتفاق رائے consensus کا ایک واضح جھلک اس وقت دیکھنے میں آیا جب ستمبر 2012ء میں جبری گمشدگیوں سے متعلق اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کے ذیلی ادارہ ورکنگ گروپ کے ایک وفد نے پاکستان خصوصاً مقبوضہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کا جائزہ لینے اور معلومات اکھٹے کرنے کی غرض سے پاکستان کا دورہ کیا۔ نہ صرف پاکستانی فوج اور خفیہ اداروں نے ورکنگ گروپ کے پاکستان آمد کی مخالفت کی بلکہ پاکستانی ربڑاسٹمپ پارلیمنٹ، اعلیٰ عدلیہ، ذرائع ابلاغ کا ایک بڑا حصہ اور سیاسی و مذہبی جماعتیں بھی ورکنگ گروپ وفد کی آمد کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور ریاستی سا لمیت کے خلاف قرار دے کر بھرپور مخالفت کی۔ ورکنگ گروپ کے وفد کی دورے نے بلوچ نسل کش کارروائیوں و پالیسی کے معاملے میں پاکستانی ریاستی ستونوں اور سیاسی و مذہبی جماعتوں

کے درمیان اتفاق رائے اوران کی منافقت کو بے نقاب کر دیا۔مقبوضہ بلوچستان میں فوج،ایف سی اورخفیہ اداروں کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر پاکستانی پارلیمان میں کبھی کبھار ہونے والے مباحث اور سپریم کورٹ میں اس بابت مقدمہ کی سماعت کا مقصد دراصل ان دونوں ریاستی ستونوں کی طرف سے ایک تو ملک میں جاری اختیارات کی رسہ کشی میں فوج اورخفیہ اداروں پر دباؤ ڈالنا ہے(کیونکہ اس غیر فطری ریاست میں آج تک مختلف ریاستی ستونوں کے مابین اختیارات کا تعین نہیں ہوسکا ہے) تو دوسری جانب ان پارلیمانی مباحث اور سپریم کورٹ میں مقدمہ کی سماعت کا مقصد پاکستان کے خونخوار چہرے پر جمہوریت،انسانی حقوق او ر انصاف کا بہروپ Mask چڑھا کر اس کی ریاستی دہشتگردی کو چھپانا ہے تاکہ رائے عامہ خصوصاً بین الاقوامی رائے عامہ کو گمراہ کیا جاسکے مگر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کونسل میں پاکستانی سکیورٹی دستوں کی ''مارواور پھینک دو'' پالیسی، بلوچ فرزندوں کی مسخ شدہ Mutilated لاشیں پھینکنے کی ظالمانہ کارروائیوں، بلوچ فرزندوں کو جبری لاپتہ کرنے، بلوچ سیاسی کارکنوں، طالب علم رہنماؤں، صحافیوں اور شہری حقوق کے حامی بلوچ فرزندوں کو نشانہ بنائے جانے کی نشاندہی اوران انسانیت سوز ریاستی کارروائیوں کو روکنے کا مطالبہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ صرف بلوچ قوم کے خلاف پاکستانی ریاستی دہشتگردی عالمی سطح پر بڑی حد تک بے نقاب ہو چکا ہے بلکہ یہ اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ بلوچ عوام خصوصاً شہداء، جبری گمشدہ فرزندوں، سرمچاروں اور آزادی پسند سیاسی قوتوں کی قربانیاں رنگ لا رہی ہیں بلوچ قومی تحریک آزادی صحیح سمت میں مثبت پیشرفت کر رہی ہے۔

یہ مبالغہ آرائی نہیں بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ اس وقت عالمی سطح پر مصروف عمل قومی تحاریک آزادی میں سب سے فعال، متحرک اور بین الاقوامی رائے عامہ کیلئے قابل قبول تحریک بلوچ قومی تحریک آزادی ہے تاہم یہ منزل نہیں ہے بلکہ منزل کی جانب درست اور مثبت پیشرفت ہے۔عالمی رائے عامہ، عالمی قوتوں اور اقوام متحدہ کی عملی مدد اور تعاون حاصل کرنے کیلئے بلوچ قومی تحریک آزادی کو یہ باور کرانا پڑے گا کہ وہ آزاد بلوچستان کو ایک مستحکم وذمہ دار ریاست کی صورت دینے کا اہل ہے۔ویسے بھی بلوچ قومی تحریک آزادی اندرونی طور پر جتنا متحد، مستحکم ومضبوط ہوگا اتنا ہی بیرونی حمایت پر اس کا انحصار کم ہوگا اور بیرونی مدد پر انحصار جتنا کم ہوگا قومی تعمیر وترقی کے بارے میں منصوبہ بندی اور پالیسی سازی کے عمل میں بلوچ اتنا ہی آزاد وخودمختار ہونگے وگرنہ مدد اور حمایت کے بدلے میں بیرونی قوتوں کی طرف سے اپنا ایجنڈا تھوپنا یا آلہ کار گروہ کھڑی کرنا کوئی نئی یا انہونی بات نہیں ہے۔تحریک آزادی کی کامیابی کیلئے عالمی اداروں،قوتوں اور رائے عامہ کی حمایت ومدد کی اہمیت سے انکار نہیں مگر کامیابی کیلئے اصل عنصر تحریک کا اندرونی محاذ پر قوت واستحکام ہے۔بلوچ قومی تحریک آزادی کی اس وقت یہ صورتحال ہے کہ تحریک کی قیادت ایک سے زائد مختلف قومی تنظیمیں کر رہی ہیں۔گوکہ یہ صورتحال اتنی بُری یا مایوس کُن نہیں ہے تاہم اسے قابل رشک یا قابل فخر بھی تو نہیں کہا جاسکتا۔آئندہ دو/تین سال بین الاقوامی اور علاقائی سطح پر سیاسی وفوجی حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں ان برسوں میں نیٹو NATO اور امریکہ افغانستان میں اپنے فوجوں کی آپریشنل حیثیت ختم کر دینگے اس موقع پر پاکستان اپنے سٹریٹجک ڈپتھ strategic depth کے دیرینہ منصوبہ کو عملی شکل دینے کیلئے افغانستان کے اندر اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے اور وہاں اپنا زیر اثر کھٹ پتلی حکومت لانے کی کوشش کرے گا اس مقصد کیلئے پاکستان کا انتخاب بجا طور پر طالبان اور دیگر مذہبی انتہاپسند گروہ ہی ہونگے اور یہی بات پاکستانی مفادات او رافغان قوم دوست قوتوں، امریکہ، یورپ، بھارت اور دیگر عالمی جمہوری وسیکولر قوتوں کے مفادات کے مابین تضاد ومخاصمت کا باعث بنے گا۔یہی وہ مناسب موقع اور صورتحال ہوگا جس کا فائدہ اٹھا کر بلوچ قومی تحریک آزادی اپنے عظیم مقصد کے حصول کیلئے عالمی حمایت ،مدد اور ہمدردیوں کا رُخ اپنی طرف موڑ سکتا ہے بصورت دیگر نجانے کتنی کٹھن صورتحال سے گذرنا پڑے۔

بلوچ قوم خصوصاً آزادی پسند بلوچ قومی قیادت،تنظیموں، جماعتوں وگروہوں اور دانشوروں کیلئے باعث فکر بات یہ ہے کہ بلوچ قومی تحریک آزادی اس وقت نہ صرف مختلف تنظیموں میں بٹا ہوا devided ہے بلکہ ان آزادی پسند تنظیموں کے مابین اتحاد، اشتراک عمل اور روابط کی صورتحال شاید اتنا مثالی ومثبت نہیں جتنا کہ 09-2004ء کے عرصہ میں تھا۔جہاں کہیں تحریک کی قیادت ایک سے زائد تنظیموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہاں تنظیمی تنگ نظری، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں، شخصیات کے درمیان ٹکراؤ، قومی واجتماعی مفادات پر تنظیمی، گروہی اور شخصی مفادات کو ترجیح دینے کی روش جیسے امراض کے حملے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔تحریک آزادی کو ایسے امراض کے خطرات سے بچانے کیلئے بڑی دوراندیشی، تحمل وتدبر کی ضرورت ہوتا ہے۔اگر تحریک کی قیادت کوئی ایک بڑی قومی تنظیم اور متفقہ قومی قیادت کر رہا ہو تو یہ احسن صورتحال ہوتا ہے جس میں کم سے کم نقصان کے بدلے بڑی کامیابیوں کا امکان ہوتا ہے اگر صورتحال اس کے برعکس ہو جیسا کہ بلوچ قومی تحریک آزادی ہے تو ایسی صورتحال میں تحریک میں شامل قوتوں کو زیادہ سنجیدگی، ذمہ داری، دوراندیشی، تدبُر اور تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے تاکہ تحریک میں شامل تمام قوتوں کو دشمن کے خلاف کم سے کم نقاط پر متحد رکھا

جاسکے۔ یہ ایک مثالی ideal کیفیت ہوگی اگر بلوچ قومی تحریک آزادی کی قیادت ورہنمائی واحد single قومی تنظیم کرے۔ ایسے قومی تنظیم کی تشکیل کی خواہش اور کوشش کرنا ہر آزادی پسند بلوچ کا حق اور فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آج کے حالات میں اسطرح کا واحد single بلوچ قومی تنظیم کی تشکیل ممکن ہے؟ زمینی حقیقت یہ ہے کہ سرے دست ایسی واحد قومی تنظیم کی تشکیل کیلئے آج بلوچ قومی تحریک آزادی میں شامل مختلف قومی تنظیموں کو آپس میں ضم Merge کرنا قدرے مشکل ہے البتہ ایک قومی اتحاد Alliance، قومی محاذ Front یا قومی کونسل کی شکل میں دشمن کے خلاف انھیں متحد کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ بدلتے وقت وحالات کا تقاضہ اور آج کی ایک اہم قومی ضرورت بھی ہے۔ تاہم دنیا کے دیگر قومی تحاریک آزادی اور بلوچ قومی تحریک آزادی کی ماضی کے تجربات کے پیش نظر اتحاد، محاذ یا کونسل کو مستحکم وپائیدار بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے منشور، تنظیمی ڈھانچہ اور مختلف اداروں وعہدیداروں کے فرائض واختیارات اور طریقہ انتخاب کو دستاویزی شکل دی جائے کیونکہ اتحادوں Alliances کی سیاست بہت نازک وحساس ہوتا ہے یہ محض زبانی اتفاق یا اعتماد پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ قومی واجتماعی مفادات اور گروہی وتنظیمی مفادات کے درمیان توازن رکھنا پڑتا ہے یہ ایسا کام ہے جوکہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ہمیں قومی آزادی کی جدوجہد کو ثمرآور بنانے کیلئے بلوچ معاشرتی ہیئت physique اور تحریک آزادی کی منقسم حالت کو سامنے رکھ کر حکمت عملی مرتب کرنا چاہیے۔ قومی وعالمی بدلتے حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اختلافی امور کو موضوع بحث بنانے کی بجائے ہمارے درمیان جو قدرِ مشترک ہے اسی کو بنیاد بناکر اختلافِ رائے کے ساتھ اشتراک واتحاد کا ہنر سیکھیں اور تحریک آزادی میں ادارہ سازی واداروں کو مضبوط کرنے پر توجہ مرکوز کریں اس مقصد کیلئے قومی سطح پر بحث ہونا چاہیئے جو قومی تحریک آزادی کی رہنمائی میں معاون اور قومی فکروشعور میں اضافہ کا باعث ہو۔ یہ بحث اس طرح کا نہیں ہونا چاہیئے جس طرح کا بحث گذشتہ دنوں بلوچستان لبریشن چارٹر کو لیکر ہوا۔ بحث اس بات پر ہونا چاہیئے تھا کہ کیا لبریشن چارٹر آزاد بلوچستان کی دستوری، قانونی، سیاسی ومعاشی ڈھانچے کا ایک قابل قبول خاکہ پیش کرتا ہے؟ کیا چارٹر میں بلوچ عوام کے امنگوں کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے؟ کیا چارٹر بلوچ عوام کو تحریک آزادی سے مطمئن وتحریک آزادی میں متحرک کرنے اور عالمی رائے عامہ کی ہمدردی وحمایت حاصل کرنے میں معاون ہوسکتا ہے؟ وہ کونسے نقاط ہیں جن کا چارٹر میں اضافہ ہونا چاہیئے یا پھر وہ کونسے نقاط ہیں جنھیں چارٹر سے حذف کیا جانا چاہیئے؟ یہ اور اسطرح کے دیگر متعلقہ امور کو زیر بحث لائے جانے کے بجائے بحث کو شغان وبہتان اور میر حیربیار مری ومیر براہمدغ بگٹی کی حمایت ومخالفت اور ان کے درمیان موازنہ comparison میں بدل دی گئی جو نہ صرف موضوعِ بحث یعنی لبریشن چارٹر کے ساتھ بڑی زیادتی ہے بلکہ اس سے ایک اچھے موضوع پر بحث کا ایک اچھا موقع بھی ضائع ہوا۔ نہیں معلوم یہ بحث بلوچ قومی تحریک آزادی کی مختلف قوتوں کو قریب لانے اور باہمی ہم آہنگی وقومی شعور کو فروغ دینے میں معاون ہوا کہ نہیں ہوا البتہ اس سے رنجشوں میں اضافہ کا احتمال وگمان پیدا ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ علاقائی اور عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے عصری حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ اختلافی امور کو نمایاں Highlight کرنے کے بجائے مختلف آزادی پسند بلوچ تنظیموں کے درمیان موجود مشترکہ مقاصد واقدار کو بنیاد بناکر ان کے درمیان اتحاد ویکجہتی کو فروغ دینے کی کوششیں ہونی چاہئیں۔ اختلافی امور کو نمایاں نہ کرنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کسی رہنما یا تنظیم کی طرف سے تحریک کیلئے مہلک غلطیوں کی نشاندہی نہ کی جائے یا اختلاف رائے پر قدغن ہو۔ قومی تحریک آزادی میں شامل مختلف قومی تنظیموں کے مابین اختلاف رائے کا ہونا ایک فطری بات ہے بلکہ ایک ہی تنظیم کے اندر بہت سے معاملات پر اختلافِ رائے یا مختلف آراء کا پایا جانا نہ صرف فطری امر ہے بلکہ یہ اس تنظیم کے ارکان کی ذہنی صحت اور شعور کا بہتر اظہار ہے تاہم بحث وتنقید کرتے وقت اختلاف رائے واختلافات اور مخالفت ومخاصمت کے درمیان فرق رکھا جانا چاہیئے۔ بلوچ قومی تحریک آزادی میں شامل تنظیموں کی قیادت اور آزادی پسند بلوچ دانشوروں کو چوکنا رہنا چاہئے کہ کہیں کچھ دوستوں کی نادانی یا دشمن کی مکاریوں کے باعث بلوچ آزادی پسند تنظیموں کے درمیان اختلاف رائے بحث ومباحثہ کے نام پر مخالفت ومخاصمت کی شکل اختیار نہ کرلے۔ تیزی سے بدلتے علاقائی وعالمی حالات کا تقاضہ ہے کہ بلوچ آزادی پسند تنظیمیں اور ان کی قیادت باہمی متفقہ قومی مقاصد پر مشتمل منشور اور طے شدہ تنظیمی ضوابط واصولوں کی بنیاد پر ایک قومی ادارے کی تشکیل کے منصوبے پر سنجیدگی سے کام کریں۔ قومی اور عالمی سطح پر بلوچ قومی تحریک آزادی کی نمائندگی ورہنمائی ایک متحدہ بلوچ قومی ادارہ کرے تاکہ بلوچ عوام، عالمی رائے عامہ، عالمی اداروں اور عالمی قوتوں کو یقین ہوکہ بلوچ قومی تحریک آزادی نہ صرف ایک آزاد مملکت بلوچستان حاصل کرنے کا اہل ہے بلکہ آزاد بلوچستان کو ایک جدید وذمہ دار ریاست کے طور پر متحد رکھنے وچلانے کا بھی اہل ہے۔

افغان مسئلہ! امریکہ و روس کیلئے لمحہ فکریہ

حفیظ حسن آبادی

اسمیں کوئی شک نہیں کہ روسی ڈپلومیسی دیرینہ تاریخ رکھتی ہے اس نے طرح طرح کے نشیب وفراز دیکھے ہیں اور یہاں ہر فیصلہ بہت ہی سوچ بچار کے بعد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے اس روسی محاورے کو ضرور ملحوظ خاطر رکھتے ہیں کہ ''جتنی اُونچائی سے گر جاؤ گے اُتنی ہی زیادہ تکلیف ہوگی'' لہذا وہ کسی بھی تعلق کی اُونچائی کی طرف پرواز سے پہلے وہاں سے گرنے کے بعد بچ کر نکلنے کے امکانات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔تاہم روس کی طرف سے پاکستان کے ساتھ تعلقات بنانے میں چند سال قبل ایک عجلت کی سی کیفیت کا گماں ہونے لگا تھا ۔جیسے یہاں کچھ لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ امریکہ وہاں سے نکل رہا ہے لہذا اُسکی جگہ جلدی لے لو۔

وسیع تناظر میں دیکھنے سے یہ بچگانہ اندازہ معلوم ہوتا ہے یا اب بھی ہے لیکن روس کی طرف سے گرم جوشی اس تصور کی موجودگی کی چغل خوری کرتی تھی۔روسی کمپنی گازپروم کی ایران پاکستان ھندوستان (آئی پی آئی) جیسے مردہ پروجیکٹ میں گہری دلچسپی سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پاکستانی حکام اپنے روسی ہم منصب عہدہ داروں کو یہ گمراہ کُن معلومات پر باور کرانے کامیاب ہوئے ہیں کہ اس گیس پائپ لائن کو بلوچستان سے گذارنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں اور ساتھ میں یہ زہریلہ پروپگنڈہ بھی کیا تھا کہ بلوچ انتہا پسند مذہبی ہیں جو ہم سب کے دشمن ہیں تاکہ روس کو بین القوامی فورمز میں بلوچوں کی نسل کُشی پر خاموش تماشائی بننے آمادہ کیا جائے۔

لیکن حقیقت عین اسکے برعکس یہ تھی اور ہے کہ بلوچستان پر پاکستان کی ریاستی گرفت کب کی ختم ہوچکی ہے وہ جس صوبائی حکومت کے بااختیار ہونے کی بات کرتے ہیں وہ دراصل ایک ناتواں و بے دست و پا کٹھ پتلی حکومت ہے اُسکے گورنر و وزیراعلیٰ اپنے صوبے کا دورہ نہیں کرسکتے وہ بیرونی سرمایہ کاروں اور اُنکے سرمایے کی کیا حفاظت کرسکیں گے۔دوسری اور بہت ہی اہم حقیقت یہ کہ بلوچ قوم نہ صرف مذہبی نہیں بلکہ اس ریجن میں واحد سیکولر قوم ہے جسکی زمین و وسائل پر قبضہ کرنے کی خاطر پاکستان اُسے مذہبی ظاہر کرکے دنیا سے اُسکی سرکوبی کی سرٹیفکٹ لینا چاہتا ہے ۔

ہمیں آج یہ بات کہتے ہوئے انتہائی اطمنان ہورہا ہے کہ ہم نے ڈھائی تین برس قبل اپنے روسی دوستوں کو غیر رسمی ملاقاتوں میں خلوص کیساتھ یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ پاکستان کی سازشوں میں آکر ایک ایسی جنگ میں نہ کود جائیں جس سے اُنھیں اپنی توانائی بے وجہ صرف کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ملنے والا۔اور روس جس آئی پی آئی پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کرنے جارہا ہے اُسکے گیس پائپ لائن بلوچستان سے گذریں گے جواب شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔دوسرا یہ کہ بلوچ قوم نے روس سمیت کسی بھی غیر مسلم ملک کی طرف نفرت سے نہیں دیکھا ہے حالانکہ پاکستان نے عیسائی، ہندو اور یہودیوں کیلئے نفرت پیدا کرنے اور مذہبی منافرت پھیلانے کیلئے ہزاروں مدرسے کھولے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ بلوچستان کے بلوچ علاقوں کو ایسی تنگ نظر رجحانات سے پراگندہ نہ کرسکا ہے جس طرح کا وہ ارادہ رکھتے تھے اپنے اس منصوبے میں ناکامی کے سزا کے طور پر پاکستان بلوچ قوم کو اُس جرم کی سزا میں مارنا چاہتا ہے جو اُس نے کی ہی نہیں ہے۔لہذا روس کو بلوچ قوم کیخلاف کسی سازش کا حصہ نہیں بننا چاہیئے۔قابل تشویش امر یہ ہے کہ اگر پاکستان کا ہاتھ اس مقام پر نہیں روکا گیا تو پاکستان ایران کی طرح اپنے مقبوضہ بلوچستان میں مذہبی جنونیت کی ایسی آبیاری کرے گا کہ پوری دنیا پر بھاری گذرے۔اُس وقت روسی دوستوں کی گرمجوشی قابل دید تھی لیکن بہت کم مدت گذرنے بعد روس کے صدر کے دورہ پاکستان کی منسوخی حالیہ دنوں میں رشین انٹی نرکوٹکس کے چیف مسٹر وکتورایوانوف کے دورے کی عین آخری لمحوں میں کینسل ہونے کا اعلان اور اب چین کے دیکھا دیکھی روس کا اس پروجیکٹ کیلئے سرمایہ فراہم کرنے سے کنارہ کشی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ روس پاکستان بارے کئی خوش گمانیوں سے نکل کر معروضی حالات کی روشنی میں درست فیصلے کی طرف جارہا ہے۔روس کا ایسا پھونک پھونک کر قدم رکھنا اس لیئے بھی لازم ہے کہ وہ اس ریجن میں نہ صرف ایک مضبوط اسٹیک ہولڈر ہے بلکہ روس وہ واحد ملک ہے جو پاکستان و ایران کی ریشہ دوانیوں اور امریکہ کی بیشمار غلطیوں سے اُس ریجن میں پیدا شدہ مشکلات پر قابو پانے میں ایک موثر کردار ادا کرسکتا ہے نہیں تو یہ سارے اسلامی انتہا پسند قوتیں افغانستان

سے امریکہ کے نکلنے کے بعد سب سے پہلے روس کیلئے بے پناہ مصیبتیں کھڑی کریں گے۔

امریکہ واس ریجن کی بدقسمتی سے افغانستان کا مسلہ تا ہنوز حل سے کوسوں دور ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پاکستان اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے باوجود افغانستان میں منفی قوت کے طور پر سب سے کامیاب ترین پارٹی ہے۔روس کے ساتھ پاکستان کے اتحاد کی باتیں اور اچھے تعلقات کے قصیدے اسی لیئے پڑھے گئے تا کہ دو بہت بڑے مقصد حاصل کئے جائیں پہلا روس کیساتھ تعلقات میں گرمجوشی سے امریکہ کی پاکستان بارے سخت پالیسیوں میں نرمی لانے کی میابی حاصل کی جاسکے دوسرا اچھے تعلقات کی آڑ میں روس کے اندر اپنے آدمیوں کی نقل و حرکت میں آسانی کے امکانات پیدا کئے جاسکے تا کہ وہ اگلے چند سالوں میں روس کے اندر خاصکر اُسکے شورش زدہ علاقوں میں اسلامی انتہا پسندوں کی ایک ایسی تعداد بنائے جو روس کو اُس وقت مصروف رکھے جب امریکہ افغانستان سے نکلے اور پاکستان وہاں اپنے طالبان کے ذریعے ''ہر چیز برباد کردو'' کی پالیسی کا باقاعدہ آغاز کرے۔روس اور اسکے اتحادی بھارت وچین نے افغانستان میں بڑی سرمایہ کاری کی ہے پاکستان وہاں ہند کا پاؤں نہ جمنے دینے کی سزا میں ہر طرف تباہی پھیلائے گا اُسکی وجہ صرف یہ نہیں کہ تباہی پھیلانا آبادی وخوشحالی لانے سے بہت آسان ہے بلکہ پاکستان کے پاس افغانستان کو بنانے یا دیگر پارٹیز کا مقابلہ کرنے کیلئے کچھ بھی نہیں ہے۔ضیاءالحق کے دور حکومت سے لیکر آج تک یہ ملک انہی دھشتگردوں کی تخریب کاریوں کو روکنے کے نام پر ملنے والے فنڈز سے چلتا رہا ہے اب امریکہ کے وہاں سے نکلنے کے بعد نہ پاکستان کو وہ سابقہ مدد مل سکے گی اور نہ امریکہ کی دوستی، جو پاکستان کی طرف سے پے در پے غیر ذمہ دار حرکتوں کی وجہ سے بگڑ کر بدترین بداعتمادیوں کے حوالے ہوچکی ہے۔اس پر سوا یہ کہ روس جس کو یہاں سے بے دخل کرنے کیلئے پاکستان نے اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا اور اُسے کافر قرار دے کر اُسکے خلاف جہاد کیا مگر اب کے بار کوئی جنگ کئے بغیر وہ فاتح کی طرح افغانستان کے اندر داخل ہوکر وہاں اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھائے گا اور اپنے قریبی اتحادی ہند کا ہاتھ مضبوط کرنے مدد دے گا۔

امریکہ اور اسکے اتحادی ممالک کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ اُن کے خلاف پیدا شدہ نفرت کو اسلامی انتہا پسند قوتیں کیش نہ کرسکیں۔یہ نفرت بھی وہی ہے جسکی نشو ونما گذشتہ چونتیس برسوں سے پاکستان میں ریاستی سرپرستی میں مذہبی جماعتوں کے ذریعے ہورہی ہے۔روس کی وہاں بھرپور انداز میں کردار ادا کرنے کی صورت میں امریکہ کے وہاں سے نکلنے کے بعد لوگ دھشت گردوں کو طاقت سمجھنے کے بجائے روس بھارت اور چین کی طرف متوجہ ہوں گے جو ظاہر ہے امریکہ کو پسند نہیں ہوگا لیکن یہ سناریو اُس ممکنہ سناریو سے کئی زیادہ بہتر ہے کہ لوگ امریکہ وافغان حکومت سے متنفر ہوکر دھشت گردوں کے ہاتھ مضبوط کریں۔پاکستان کی دلچسپی اِسی میں ہے کہ ایک طرف امریکہ واسکے اتحادی رہیں دوسری طرف وہ اور اُسکے طالبان تا کہ وہ اِنکے ذریعے امریکہ و باقی دنیا کو جہاں تک ممکن ہو بلیک میل کرسکے۔امریکہ کیلئے انتخاب کے مواقع اتنے زیادہ دکھائی نہیں دیتے اگر ہیں بھی لیکن تاحال امریکہ اُنکی طرف سوچنے کی زحمت نہیں کررہا یا کم ازکم ہمیں اس بات کے آثار دکھائی نہیں دے رہے کہ وہاں اکیڈمک لیول پر اس زاویے پر سوچا جارہا ہے جس سے مثبت نتائج کی توقع کی جاسکے۔جو کوششیں امریکہ افغان حکومت کے ذریعے طالبان کے ساتھ بات چیت واُنھیں پاکستان کی جیلوں سے آزاد کرنے کی شکل میں کررہا ہے اُنکا نتیجہ منفی زیرو آئے گا کیونکہ یہ وہ کھیل ہے جو پاکستان امریکہ وافغان حکومت کا وقت وانرجی ضائع کرنے کیلئے کھیلنا چاہتا ہے۔

اس ضمن میں امریکہ اور افغان حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس مسئلے کے حل بارے مثبت سوچیں اور اچھی اُمید رکھیں کہ تمام افغان اسٹیک ہولڈرز کو آن بورڈ لیا جائے اور سب ملکر نئے افغانستان کی تعمیر نو کریں گے جبکہ پاکستان اور اسکے اتحادی طالبان بالکل دوسرے زاویے سے سوچتے ہیں اُنکی سوچ یہ ہے کہ امریکہ اور اسکے اتحادی شکست کھاچکے ہیں وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کو اچھے لفظوں میں ''افغانستان سے انخلا'' کا نام دیتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امریکہ مکمل انخلا نہیں کرے گا بلکہ صرف اپنے فوجیوں کی جان بچانے افغانوں کو فرنٹ لائن پر مرنے کیلئے دھکیلے گا اور خود کہیں سی چھاؤنی میں بیٹھ کر وہاں سے ڈوریں ہلائے گا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر امریکہ اپنے تمام قوت کیساتھ لڑکر طالبان کو زیر نہ کرسکا تو یہ کم تربیت یافتہ افغان کب تک ٹِک سکیں گے؟ اور خاصکر اس صورتحال میں جب ایک بھائی طالب ہے تو دوسرا افغان فوج کا عسکر لہذا جس ڈگر پر پاکستان چلا ہے اُسی پر چلا جائے جس نے کم ازکم یہ نتیجہ تو دیا ہے کہ افغانستان امریکہ واتحادیوں سے سنبھالا نہیں جاتا۔افغان حکومت اور امریکہ کی خواہش ہے کہ پاکستان وزیرستان وآزاد

قبائل میں اپنی رٹ قائم کرے تاکہ وہاں سے بین القوامی امن کو تباہ کرنے کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو لیکن پاکستان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرسکتا کیونکہ کسی سے بھی بہتر خود پاکستانی ارباب اقتدار اس بات سے واقف ہیں کہ وہاں مسئلہ شریعت کے نظام کا نفاذ نہیں بلکہ وہاں پاکستان کے ''اچھے طالبان'' و انتہاپسندوں کے پناہ دینے اور وہاں سے اربوں ڈالر منشیات کے اسمگلنگ کیلئے ماحول موافق بنانا ہے۔ وہاں مکمل امن ہونے کی صورت میں بین القوامی مبصرو ماہرین آنا چاہیں گے اور وہ اصل حقیقت سے آگاہ ہوں گے جسے پاکستان کبھی بھی نہیں چاہے گا۔

امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی خواہش ہے کہ پاکستان جاندار و دیانتدار اتحادی کی طرح وہی کردار نبھائے جس سے وہ توقع رکھتے ہیں لیکن پاکستان ایسا کرنے سے قاصر ہے کیونکہ پاکستان اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اُسکے تمام ادارے ایک دوسرے کے ساتھ براہ راست تصادم میں ہیں۔ اسکے تمام ادارے بشمول اسٹراٹیجی حوالے سے ریڈ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے شعبے ریلوے، پی آئی اے اور اسٹیل مل کب کا بھاری قرضوں کے مصنوعی تنفس کی مدد سے رینگ رہے ہیں۔ یہاں تمام قومیتیں بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہیں جبکہ بلوچ قوم بغیر کسی لگی لپٹی کے آزادی کا مطالبہ کررہی ہے۔ داخلی سنگین صورتحال کے پیش نظر بیرونی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ بین القوامی منڈی میں پاکستان اپنا اعتماد کھو چکا ہے داخلی طور پر اُسے بلوچستان میں جنگ آزادی کے سبب توانائی کے بحران کا سامنا ہے جس سے ہزاروں سرمایہ کار اپنا سرمایہ یہاں سے نکال کر دوسرے ممالک منتقل ہو چکے ہیں۔ لاکھوں لوگ اپنا روزگار کھونے کے بعد نان شبینہ کا محتاج ہیں۔ لوگوں کی مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے لاکھوں بچے اسکول جانے کے بجائے مدرسوں میں بھیجے جاتے ہیں وہاں وہ نہ صرف اسکول فیس سے آزاد ہوں گے بلکہ اُنھیں مدرسوں میں کھانا بھی کھلایا جاتا ہے۔ یوں پاکستان کے تمام کارخانے بند ہو چکے ہیں یا بند ہو رہے ہیں اور اُن سے فارغ لوگ اور اُنکے بچے شعوری یا لاشعوری طور پر یا مجبوری سے ان انتہا پسندوں کے چنگل میں پھنس جائیں گے جنکے بالغ لوگ تبلیغی جماعتوں کے ذریعے موبلائز کئے جائیں گے یا اُنھیں اسلامی دفاعی کونسل جیسے جہادی تنظیموں میں فعال کیا جائیگا جنہیں سابق فوجی اعلیٰ عہدہ دار یا جہادی ملا چلاتے ہیں اور ان محروم لوگوں کے چھوٹے بچوں کو مدرسوں میں طالب کے نام پر مستقبل کا مجاہد بنایا جاتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ان تمام خراب کاریوں اور تباہ کاریوں کے باوجود پاکستانی ارباب اقتدار روازانہ آٹھ ارب روپے کی کرپشن بھی کرتے ہیں۔

اس مختصر بحث میں ہم اس بڑے مسئلے کے ایک ایک پہلو کو الگ کرکے اُنکا تجزیہ و تحلیل کے ساتھ نتیجہ گیری نہیں کرسکتے تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ اور روس اپنے اتحادیوں سمیت اس ریجن میں مسائل کے حل کیلئے بلوچ و پختون فیکٹر کو پاکستان کی جغرافیہ سے ہٹ کر دیکھیں۔ امریکہ و روس کی نسبت پاکستان اسکی اہمیت کو زیادہ سمجھتا ہے اس لیئے اُس نے بلوچستان میں مدرسوں کا جال بچھا کر اُسکی خشکی کو اسلامی انتہا پسندوں کی پناہ گاہ اور سمندر کو سمندری قزاقوں کے حوالے کرنے کے منصوبوں پر تیزی سے کام کررہا ہے تاکہ بلوچ قوم پاکستان سے آزادی مانگنے کی جرات کی ''جرم'' میں صدیوں ایسی مصیبتوں کے حوالے ہو کہ نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہ دے۔ ایسا کرکے اُسکی خواہش یہی ہوگی کہ افغان مسئلہ اُس وقت تک حل نہ ہو کہ سب تھک ہار کر اُسے پاکستان کے حوالے کرنے راضی نہ ہوں اور وہ اُسے اپنا پانچواں صوبہ بنائے جس کا اظہار اُس کے دانشور اکثر و بیشتر اپنے ٹی وی ٹاک شوز میں بلا جھجک کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان کی پالیسی اس ریجن بارے روز روشن کی طرح عیاں ہے جو تمام مہذب دنیا کے امنگوں سے متصادم ہے اب سوال یہ ہے کہ امریکہ و روس صرف درست سمت سوچنے کی حد تک خود کو محدود کریں گے یا اس پر مزید کام کرکے اُسے کسی انجام تک پہنچائیں گے یا ماضی کی کوتاہیوں کو دہرانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے یہاں قومیتوں کے مسائل پر خاطر خواہ توجہ دیے بغیر پاکستان بارے دوٹوک موقف اپنانے سے کترائیں گے۔

روشنی کا سورج ضرور طلوع ہوگا لیکن اس کیلئے دانشمندی کے اسلحے سے لیس ہونا ضروری و لازمی ہے۔

☆☆☆ کامریڈ فدا احمد بلوچ ☆☆☆

کوریا غلامی اور آزادی کی کٹھن راہ پر

زرین فاطمہ

جاپان کے مغرب میں سرسبز و شاداب کوریا تین طرف سے بحرالکاہل کے نیلے پانیوں میں گھرا ہوا ہے۔اس کے ساحل کے کنارے ان گنت خوبصورت چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔یہ جزائر بہت چھوٹے اور غیر آباد ہیں۔لیکن یہ اس قدر حسین ہیں کہ انہوں نے کوریا میں ایک ایسی صنف شاعری کو پروان چڑھایا جس میں قدرت کے حسن کی تعریف کی جاتی ہے۔صدیوں سے انسانی تخیل والفاظ اس قدرتی حسن کے اسیر ہیں۔جزیرہ نما کوریا کو ایک طویل عرصے سے اپنے طاقتور پڑوسی چین کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا۔پھر جاپان کے تیز رفتار صنعتی سرمایہ داری نظام کی جارحیت کا ایشیا میں پہلا شکار کوریا تھا۔کوریا نے غلامی و آزادی کی اس کٹھن کشمکش میں اپنی شناخت اور انفرادیت برقرار رکھی۔

جغرافیہ اور قدیم تاریخ:

کوریا کا شمالی اور مشرقی علاقہ پہاڑی ہے۔اس کے شمال میں یالو اور تومین دریا بہتے ہیں جو اسے منچوریا سے الگ کرتے ہیں۔دریائے تومین کے ڈیلٹائی علاقے میں اس کی گیارہ میل لمبی رحد روسی سائبیریا سے ملتی ہے۔کوریا کے جنوب اور مغرب کے علاقے میں پہاڑ بھی ہیں اور وادیاں بھی۔مشہور خوبصورت پہاڑ''کماگنگ سان'' وسطی کوریا میں ہے۔کوریا کے مشرقی ساحل کے برعکس جنوبی اور مغربی ساحل پر بہت سی اچھی بندرگاہیں ہیں۔اس کا مشرقی ساحل پن بجلی کے کارخانے اور سمندر سے مچھلیاں پکڑنے کے لئے بہت مفید ہے۔اس کے مغربی علاقے میں چاول خوب پیدا ہوتا ہے۔پیونگ یانگ اور سیول کے قریب کا علاقہ بھی زرخیز ہے۔کوریا میں سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی پڑتی ہے۔یہاں کبھی سیلاب آتے ہیں اور کبھی قحط پڑتے ہیں۔شمالی کوریا میں کاشت کاری موسم بہت ہی مختصر ہوتا ہے،لیکن جنوب کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔کوریا معدنیات سے مالا مال ہے۔یہاں کوئلے کے وسیع ذخیرے ہیں۔کوریا سونے کے ذخائر کے لحاظ سے دنیا میں پانچویں نمبر پر ہے۔اس کا رقبہ 85,228 مربع میل ہے۔اس کا ساحل 5400 میل لمبا ہے۔اس کے بلند و بالا پہاڑ گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔لیکن شہروں کے گرد درخت بہت زیادہ کٹ چکے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق 2000 ق م مختلف قبائل کوریا میں آباد ہونے لگے تھے۔یہ قبائل منچوریا،منگولیا اور وسطی ایشیا سے کوریا پہنچے تھے۔ان کا تعلق زیادہ تر منگول نسل سے تھا۔لیکن یہ منگولوں سے زیادہ صحت منداور بلند قامت تھے۔یہ قبائل غالباً اپنے ساتھ کانسی اور لوہے کیدھاتوں کے استعمال کا ہنر بھی لے کر کوریا کی سرزمین پر آئے تھے۔وہ کانسی اور لوہے کی دھاتوں کے استعمال کے ہنر سے واقف تھے۔ان کی صلاحیتوں کے باعث کوریا ترقی کرنے لگا۔چین نے 108 ق م کوریا پر حملہ کیا اور وہ شمالی کوریا کے کئی حصوں پر قابض ہو گیا۔اس دور میں کوریا تین حصوں میں تقسیم تھا۔شمال میں ایک جنگجو،کوگر یو بادشاہت اور جنوب مین 'سیلا' اور جنوب مغرب میں 'پائیک چے' بادشاہت قائم تھی۔کوگر یو ایک طویل عرصے تک بیرونی وحشی قبائل اور چین کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے۔انہوں نے 613 میں چین کو لڑائی میں شکست دی۔لیکن کچھ عرصے بعد چین کے''تانگ'' کا ندان کے دور میں وہ چینی اور سیلا ریاست کے حملہ آوروں سے شکست کھا گئے۔سیلا حکومت نے چین کے ساتھ مل کر اپنی دونوں مقابل بادشاہتوں کو شکست دی اور 668 سے پورے کوریا پر حکومت کرنے لے۔انہوں نے تین سو سال تک کوریا پر حکومت کی۔اس دور میں کوریا کی تہذیب و تمدن نے بڑی ترقی کی۔اسی لئے اسے کوریا کی تاریخ کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔اس کا دارالحکومت کیونگ جو تھا۔اس دور میں بے شمار بڑے شاندار مندر،بدھ خانقاہیں اور پگوڈا تعمیر ہوئے۔

کوریو خاندان (935-1392) کی بادشاہت کئی سو سال تک قائم رہی۔اسی بادشاہ کے نام پر اس ریاست کو کوریا کہا جانے لگا۔اس کا دارالحکومت 'سونگ دؤ' تھا۔ آخری دو صدیوں کے دوران منگول بار بار حملے کرتے رہے۔ان حملوں سے تھک کر بادشاہ نے منگولوں کی حاکمیت کو تسلیم کیا اور ایک منگول شہزادی سے شادی کر لی۔1275 میں جب منگولوں نے جاپان پر حملہ کیا تو اس لڑائی میں کوریا نے بھی منگولوں کا ساتھ دیا۔جاپانی بحری قزاق کوریا کے ساحلی علاقوں

میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔کوریا ان کے خلاف مستقل فوجی کاروائی کرتا تھا۔کوریو حکومت چین کی منگول حکومت ختم ہو جانے کے بعد بھی قائم رہی۔کوریو حکومت کو اس کے اپنے ایک جنرل 'یے۔سونگ۔گی' نے ختم کیا۔جنرل 'یے۔۔سونگ۔گی' نے ایک نئی 'یے' بادشاہت (1392-1910) کی بنیاد ڈالی۔اس کا دارلحکومت 'حان یانگ' تھا جیسے اب سیول کہا جاتا ہے۔یہ خاندان ایک طویل عرصے تک کوریا پر حکومت کرتا رہا۔اس خاندان نے کوریا کی تہذیبی ترقی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

انتظام سلطنت: 'یے' خاندان کے ابتدائی دور سے چین کا نظام حکومت کوریا میں نافذ کر دیا گیا۔ملک میں ایک ریاستی کونسل، ایک شاہی سیکریٹریٹ اور ملا زمین، ٹیکس، رسومات، جنگ، انصاف اور عوامی تعمیرات کی اچھے وزارتیں قائم کی گئیں۔شاہی سیکریٹریٹ احکامات جاری کرتا تھا۔ہر وزارت کا ایک سیکریٹری تھا۔ابتداء میں ان سب کی نگرانی ریاستی کونسل کرتی تھی۔لیکن بعد میں بادشاہ براہ راست ان محکموں کو کنٹرول کرنے لگا۔افسروں اور امراء کی خفیہ نگرانی کا بھی ایک ادارہ تھا، جو بادشاہ کے سامنے جواب دہ تھا۔رفتہ رفتہ یہ ادارہ بہت طاقتور ہو گیا تھا۔اعلی افسروں کو ''یانگ بان'' کہا جاتا تھا۔اس کے معنی ہیں 'دو گروہ' یعنی سول اور فوجی افسر۔وہ عموماً امیر طبقے تعلق رکھتے تھے۔ہر امیر خاندان سے ایک افسر ضرور لیا جاتا تھا۔ملک کی ساری دولت و طاقت امراء بڑے زمین دار اور افسروں کے ہاتھ میں تھی۔کوریا میں بھی افسروں کے انتخابات کے لئے چین کیطرح امتحان کا نظام رائج تھا۔کوریا کا بادشاہ چین کے بادشاہ کیطرح مطلق العنان نہیں تھا۔کوریا کے امراء اور 'یانگ بان' کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی۔

کنفوشس کے نظریات اور بدھ مت چین کے علاوہ کوریا بھی پھیل گئے تھے۔یہ دونوں عقائد کوریا کی تہذیب کا حصہ بن گئے۔کنفوشس کے تصورات بادشاہ، بڑے زمینداروں اور افسروں کو سماج میں وسیع اختیارات دیتے تھے۔کوریا کے ادب وفن پر بھی چین کا گہرا اثر تھا۔چین سے تاریخ نویسی کا جن بھی کوریا آیا اور اسے یہاں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔کوریا کی تاریخ 'کوریوسا' 1451 میں مکمل ہوئی۔کوریا کے امراء نے چینی زبان کو قبول کر لیا تھا لیکن عوام کوریائی زبان ہی بولتے تھے۔ایک کوریائی بادشاہ 'سی جونگ' نے کوریا کے رسم الخط کو ترقی دی۔یہ 1446 سے سرکاری طور پر استعمال کیا جانے لگا۔اس میں 28 حروف تہجی تھے۔اس کی وجہ سے کوریا کے ادب نے تیزی سے ترقی کی۔سب سے پہلی ادبی کتاب 'حونگ۔کل۔ٹونگ۔جون کی کہانی'' تھی۔اس کے بعد مسلسل ناول لکھے جاتے رہے۔ایک نامعلوم مصنف کی تخلیق 'چونھ۔یانگ۔جون' آج تک کوریا میں مقبول ہے۔کوریا میں بھی ناول اور کتھا سنانے کے درمیان گہر اتعلق تھا۔امیر شخص کتاب خریدنے کی بجائے کتھا سنانے والے کو طلب کرتا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈھول کی تھاپ پر کبھی ایک یا دو دن تک کہانی سنایا کرتا تھا۔

''یے'' خاندان کے دور میں مختلف علوم وفنون ترقی کرتے رہے۔نئی ایجادیں کی گئیں، نئے انداز سے سوچا گیا۔چودہویں صدی میں ''گیٹن برگ'' کی اینسائکلو پیڈیا چھپنے سے پچاس سال پہلے کوریا میں میٹل ٹائپ سے کتابیں چھپنے لگی تھیں۔

کسان بغاوت: زمین دار طبقے کے استحصال اور بھاریسر کاری ٹیکسوں کے خلاف کوریا کے کسان بغاوت کیا کرتے تھے۔سیلاب اور قحط کے زمانے میں اکثر وہ تنگ آ کر ان دونوں طبقوں کے ظلم وستم کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتے تھے۔کوریا میں چین اور ویت نام جیسی کسان بغاوتیں نہیں ہوئی۔انیسویں صدی میں کوریا کے کئی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ہوئیں۔ٹونگ حاک بغاوت زیادہ مشہور ہے۔''ٹونگ حاک'' کے معنی ہیں ''مشرقی علم''۔اسکے مذہبی تصورات عیسائیت، کنفوشس، تاو اور بدھ مت سے لئے گئے تھے۔اس کی بنیاد 'چوئے چیو' (1824-1864) نے رکھی۔لیکن وہ اس بغاوت کا رہنما تھا۔یہ بغاوت 1862 میں شروع ہوئی تھی۔'چوئے چیو' کو دوسرے سال گرفتار کر لیا گیا اور 1864 میں پھانسی دی گئی۔اس کی پھانسی کی سزا نے مخالفت میں اور شدت پیدا کر دی اور 1894 تک ''یے'' سرکار کے خلاف بغاوت جاری رہی۔بادشاہ اور امراء نے اپنے سرپرست چین سے مدد طلب کی۔کوریا نے جاپان سے مدد نہیں مانگی تھی۔لیکن جاپان نے چین سے چھے گنا زیادہ فوج بھیج دی۔23 جولائی 1894 کو جاپان بادشاہ کے محل پر حملہ کر دیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔کوریا پر قبضہ کرنے کے لئے چینی اور جاپانی سامراجیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔اس مختصر لڑائی میں چین کو شکست ہوئی اور اس کی فوجیں کوریا سے واپس چلی

گئیں۔ ''ٹونگ حاک''، تحریک کے حامی ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت کے سخت خلاف تھے۔

جاپانی سامراج کا تسلط:

کوریا میں ایک طاقتور زمین دار نظام رائج تھا۔ کسان طبقہ بھاری کرایوں اور ٹیکسوں کے باعث ناداری اور تنگ دستی کا شکار تھا۔ یہ سماجی تضاد ملک کو سیاسی اور معاشی طور پر کمزور کر رہا تھا۔ انیسویں صدی میں مشرقی بعید میں یورپی سامراجیوں کی مداخلت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے صنعتی سرمایہ داری نظام کو نئی منڈیوں اور خام مال کی ضرورت تھی۔ جاپان کا صنعتی سرمایہ داری نظام تیزی سے ترقی کر کے یورپی سرمایہ دای نظام کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ اس کی نظر بھی اپنے پڑوسی ممالک کوریا اور چین کی منڈیوں اور کام وسائل پر تھی۔ اس خطرناک صورت حال سے بے پرواہ امراء سیاسی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ چونکہ بادشاہ کمزور تھا، اس لئے اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کئی امراء جاپان کی حمایت کر رہے تھے۔ کوریا کی ملکہ کا تعلق ایک طاقتور 'مین' قبیلے سے تھا۔ وہ بھی جاپان کی حمایت کرتی تھی۔ جاپان کے دباو سے مجبور ہو کر کوریا نے 1876 میں تین بندرگاہیں جاپانیوں کے لئے کھول دیں۔ کوریا پر جاپان کا اثر بڑھتا رہا۔ 1894-1895 کی چین و جاپان جنگ کے بد چین نے شیمونوسکی معاہدے پر دستخط کر دیے اور کوریا کی آزاد حیثیت کو تسلیم کر لیا۔ کوریا میں جاپان کا اثر تیزی سے بڑھ گیا۔ جاپان نے 1895 میں کوریا میں مشیر مقرر کیے۔ وہ سرکاری معاملات میں اتنی زیادہ مداخلت کرنے لگے کہ ان سے تنگ آ کر کوریا کی با اثر ملکہ نے روس سے مدد مانگی۔ اس پر ناراض ہو کر جاپانی ایجنٹ نے ملکہ کو قتل کروا دیا۔ اس عرصے میں روس نے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ وہ اب اپنی حدود کوریا تک پھیلانا چاہتا تھا۔ دونوں سامراجی ممالک روس اور جاپان کے درمیان نوآبادی کے حصول کے لئے 1904 - 1905 میں جنگ چھڑ گئی۔ جس میں روس کو شکست ہوئی۔ 1905 میں کوریا کے بادشاہ نے جاپان کو مزید اختیارات دینے کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ناراض ہو کر جاپانی فوج نے محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جاپانی افسروں نے کوریا کے وزیر اعظم کو گھسیٹ کر کانفرنس ہال سے باہر نکالا۔ کئی وزیروں نے ڈر کر ان کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ اپنے ملک کی اس بے عزتی پر دل برداشتہ ہو کر وزیر جنگ نے خودکشی کر لی۔

اب کوریا جاپان کے کنٹرول میں تھا۔ جاپان نے اگست 1910 میں کوریا کو باقاعدہ اپنی نوآبادی قرار دے دیا۔ جاپان کے برسر اقتدار طبقے اور فوج نے اپنے صدیوں پرانے پڑوسی ملک کی آزادی چھین لی۔ کوریا میں ایک جاپانی گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ ملک میں ایک سخت فوجی اور پولیس راج قائم ہو گیا۔ جاپانی سامراج نے 1910 سے 1920 کے درمیان ایک اسی انتظامی مشینری تشکیل دی اور ایک ایسا طریقہ کار وضع کیا جس کے تحت کوریا کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استحصال کیا جا سکے۔ جاپان نے کوریا کے سماج میں سے غدار وطن دشمن امراء اور متوسط طبقے کے بھی ایسے افراد کو ڈھونڈ نکالا جو کوریا کے سماجی اور معاشی استحصال میں سامراجیوں کے ساتھی اور مددگار بن جائیں۔ جاپان نے 1931 میں چین پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کی جنگی ضروریات میں تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے کوریا میں نئی صنعتیں قائم کیں۔

عوامی مزاحمت:

پہلی بار کوریا کسی کا غلام بنا تھا۔ چینی شہنشاہیت کی مداخلت کی نوعیت بڑی مختلف تھی۔ کوریا میں غیر ملکی تسلط کے خلاف سخت غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ عوام نے جاپانی سامراج کے خلاف مسلح جنگ شروع کر دی۔ جاپان نے کوریا کے بادشاہ کو تخت سے ہٹا دیا اور پھر اگست 1907 کو کوریا کی فوج بھی توڑ دی گئی۔ 30 مئی 1910 کو جاپان کے وزیر ٹیروچی کو کوریا کا گورنر جنرل بھی بنا دیا گیا۔ 1905 سے 1910 کے دوران مختلف اقدامات کے ذریعے کوریا کی آزادی چھین لی گئی۔ کوریا میں جاپان کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں۔

1۔ پہلی بغاوت مئی 1906 میں کوریا کے جنوب میں 'حونگ۔ جو' کے شہر میں ہوئی۔ 'سچائی کے راستے پر چلنے والی آرمی' کے کمانڈر 'منگ۔ چونگ۔ سلک' نے اس لڑائی کو اپنے وطن کی آزادی کی جنگ قرار دیا۔ اس نے اس معاہدے کی سخت مذمت کی جس کے تحت جاپان کو کوریا کے خارجی امور پر مکمل اختیار دے دیا گیا تھا۔ اس نے 'حونگ۔ جو' کے شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن جاپانی فوج نے انہیں شکست دے دی۔ 80 محبّ وطن کوریائی مارے گئے اور 150 گرفتار ہوئے۔

2۔ دوسری بغاوت کے رہنما ایک دانشور 'چوئی۔ اک۔ ریون' تھے۔ انہوں

نے غیر ملکی مداخلت کے خلاف سارے ملک میں لوگوں کو ایک اپیل بھیجی۔ انہو ں نے نوجوانوں اور اہل علم سے اپیل کی کہ وہ غیر ملکی محکومیت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی اور شمالی 'چیولا' کے لیڈر 'یم۔ پیونگ۔ چان' کی مشترکہ فو جوں کو جاپان نے شکست دی اور وہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔

3۔ بادشاہ ہٹائے جانے اور فوج کے ختم کیے جانے کے خلاف 1907 کے موسم گرما میں سیول میں بڑے ہنگامے ہوئے۔ عوام نے جاپانی سامراجیوں کے خلا ف ہتھیار اٹھالئے۔ جاپانی فوج اور پولیس نے بڑی بربریت سے اس احتجاج کو ختم کیا۔ کوریا کے طول وعرض میں ان اقدامات کے خلاف ہنگامے ہوتے رہے۔ 1907 سے 1908 کے دوران جاپان نے 14566 قوم پرستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور ہزاروں پ تشدد کیا گیا۔ 1915 تک کوریا کے مختلف حصوں میں مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں اور جاپا نی فوج انہیں وحشیانہ طور سے کچلتی رہی۔ کوریا کے محبّ وطن عوام اپنی پرانی رائفلو ں، پستولوں، خنجروں اور بھالوں سے بیسویں صدی کی مشین گنوں کا مقابلہ کر تے رہے۔ آخر کئی باغی لیڈروں نے ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن شمالی کوریا کے پہا ڑی علاقوں میں عوام مسلسل لڑتے رہے۔ بہت سے قوم پرست منچوریا چلے گئے اور وہاں سے سرحد پار کر کے جاپانیوں پر چھاپہ مار حملے کرنے لگے۔ دوسری طر ف کوریا کے شاہی خاندان اور درباریوں نے جاپان کے وظیفے حاصل کر کے غیر ملکی حملہ آوروں کی حاکمیت تسلیم کر لی۔

یورپی سامراجیوں کی پہلی عظیم جنگ ختم ہوئی تو اس کی تباہی و بربادی کو بھلا کر پھر نئے سرے سے آپس میں نوآبادیوں کا بٹوارہ ہونے لگا۔ یورپ کے سامراجیو ں نے زر اور زمین کی ہوس میں نوآبادیوں کے لاکھوں غلاموں کے علاوہ خود اپنے لاکھوں ہم وطن مزدوروں اور کسانوں کو جنگ کے محاذوں پر بارود اور بیماریو ں سے ہلاک کیا تھا۔ اب نئے منافعے کے حصول کے لئے نئی منصوبہ بندی کی جا رہی تھی۔ لیکن یورپ میں ہی زار کی بادشاہت ختم ہو چکی تھی اور مزدور طبقے نے سوشلسٹ انقلاب برپا کیا تھا۔ ہند نے امرتسر کے جلیاں والا باغ میں برطانوی درندگی دیکھی تھی اور پورے ملک میں اس کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ چین میں 1919 سے طالب علم غیر ملکیوں کے خلاف منظّم تحریک چلا رہے تھے۔ مصر میں برطانوی سامراج کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے۔ ہر طر ف غلام اپنا حق اور اپنی آزادی طلب کر رہے تھے۔ رنگ و نسل، مذہب و قومیت کے اختلاف کے باوجود ہر ملک کے عوام آزادی و خودمختاری کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔

20 جنوری 1919 کو کوریا کے بادشاہ کی موت کے بعد پورے کوریا کے 33 مشہور شہریوں نے کوریا کی آزادی کا اعلان نامہ اپنے دستخطوں سے جاری کیا۔ یہ اعلان یکم مارچ 1919 کے جلسوں میں پڑھ کر سنایا گیا۔ ان جلسوں میں تقریریں کی گئیں، کوریا کے جھنڈے لہرائے گئے اور 'مانسی' کے نعرے لگائے گئے۔ ان مظاہروں میں کوریا کے لاکھوں لوگوں نے حصہ لیا۔ یہ سیول سے سا رے ملک میں پھیل گئے۔ جاپانی حیرت زدہ تھے کہ کوریا میں جاپانی خفیہ پولیس کا طاقتور نظام تھا۔ لیکن قوم پرستوں نے اتنی خاموشی سے اس تحریک کو منظّم کیا تھا کہ جاپانی پولیس کو علم ہی نہ ہو سکا۔ انہوں نے سخت انتقامانہ کاروائی کی اور نہایت وحشیانہ تشدد سے اس آزادی کی تحریک کو کچل دیا۔ قوم پرست کہتے ہیں کہ 7000 سے زیادہ لوگ ہلاک کر دیے گئے۔ کئی سال تک ہزاروں کوریائی جیلو ں میں قید رہے۔ جاپانی سرکار جرمنوں اور بلشوک پر انہیں بھڑکانے کا الزام لگا تی رہی۔ چونکہ جاپانی سامراج کوریا پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے سخت تشدد سے عوامی جدوجہد کو ختم کر دیا۔

سیاسی تنظیمیں:

1919 کی تحریک سختی سے کچل دی گئی۔ لیکن کئی سال تک پورا کوریا اس سے متا ثر رہا۔ ہر سال یکم مارچ اور 29 اگست کو پورے ملک میں یہ افواہ پھیل جاتی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اس سیاسی جدوجہد نے کوریا میں کئی ٹریڈ یونینز، سیاسی پا رٹیوں اور بائیں بازو کی تنظیموں کو جنم دیا۔ ان کا مقصد اپنے حقوق کے لئے جد جہد کرنا تھا۔ جاپانیوں کے تشدد کے بعد' کے۔ جو' میں منتخب لیبر باہمی مدد سوسائٹی ، قائم ہوئی۔ یہ پرولتاریہ تحریک کی طرف پہلا قدم تھا۔ 1920 میں نوجوانوں کی بے شمار انجمنیں قائم ہوئیں۔ انہوں نے متحد ہو کر 'کورین نوجوانوں کی یو نین' قائم کی۔ اسے سرکار نے ختم کر دیا۔ 1922 میں 'موشان۔ دوشی' یعنی پر لتاریائی کامریڈز سوسائٹی قائم ہوئی۔ یہ سوشلسٹ اصولوں پر منظّم کی گئی تھی۔ اس کا نعرہ تھا 'پرولتاریہ اپنے زندہ رہنے کے حق کی حفاظت کرو' 1920 سے 1925 کے دوران مزدوروں کی 330 ہڑتالیں ہو

ئیں۔1924 میں 'منتخب مزدوروں اور کسانوں کی یونین' قائم کی گئی۔لیکن اسے فوراً ہی سرکار نے غیر قانونی قرار دے دیا۔لیکن یہ تنظیم آہستہ آہستہ پورے کوریا میں پھیل گئی۔1925 میں کمیونسٹ پارٹی آف کوریا اور کمیونسٹ نوجوان ایسویشن قائم کی گئی۔ان کے بیشتر ارکان نومبر 1925 میں 'شین گیشو' میں گرفتار کر لئے گئے۔لیکن بہت سے نئے کارکن اس میں شامل ہو گئے۔انہوں نے اس تنظیم کو زندہ رکھا۔انہیں بھی جو 1926 میں گرفتار کر لیا گیا۔اس کے باوجود نئے لوگ اس میں شامل ہو گئے۔انہیں پھر' کے۔جو' اور دوسرے شہروں میں گرفتار کر لیا گیا۔لیکن ان مسلسل گرفتاریوں کے باوجود پارٹی میں نئے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہوتے رہے۔

جاپانی تشدد سے بچنے کے لئے بہت سے کوریائی قوم پرست کوریا کی سرحد کے پار منچوریا اور سائبیریا میں آباد ہو گئے تھے۔وہ وہاں سے کوریا میں جاپانیوں پر چھاپہ مار حملے کرنے لگے۔اس کا انتقام لینے کے لئے جاپانیوں نے منچوریا میں 'کاندہ' کے علاقے پر حملہ کر کے ہزاروں کوریائیوں کو ہلاک کیا اور پھر شہر کے چوک میں ان کی لاشیں جلا دی گئیں۔لیکن یہ ظالمانہ اقدامات آزادی کی جدوجہد کو کمزور نہ کر سکے۔1932 میں کوریا کے قوم پرستوں نے ٹوکیو میں جاپان کے بادشاہ پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ کیا۔جنرل 'شیرا کاوا' پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا۔1919 کی بغاوت کے بعد پہلی عارضی کوریائی حکومت شنگھائی میں قائم کی گئی تھی۔یہ دنیا کی سب سے پرانی جلاوطن حکومت تھی۔

جاپان نے ستمبر 1931 کو چین کے صوبے منچوریا پر حملہ کر دیا۔چین میں اس حملے کی شدید مخالفت ہوئی اور جاپان کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع ہو گئی۔اس کا اثر کوریا پر بھی پڑا اور کوریا میں بھی جاپان کے خلاف مسلح جدوجہد ہونے لگی۔اسے کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔لیکن بائیں بازو کے لیڈر کم ال سنگھ کی پارٹی شمالی کوریا میں مسلسل جاپان کے خلاف چھاپہ مار جنگ لڑتی رہی۔کم ال سنگھ نے اپریل 1932 میں 'جاپان مخالف عوامی چھاپہ مار آرمی' قائم کی۔جس نے کوریا کے کئی علاقوں میں اپنے اڈے قائم کیئے۔1934 میں اسے دوبارہ 'کوریا عوامی انقلابی آرمی' کے نام سے منظّم کیا گیا۔کوریا کے عوام آزادی چاہتے تھے۔وہ غیر ملکی سامراجی سے ہر قیمت پر نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔اس لئے انہوں نے بائیں بازو کے ان چھاپہ مار گروپوں کا ساتھ دیا۔1945 تک ان کی یہ چھاپہ مار لڑائی جاری رہی۔جاپان کی شکست کے بعد کوریا میں قائم جاپانی سرکار بھی دم توڑ گئی۔

جاپان نے 35 سال تک کوریا پر براہ راست حکومت کی۔جاپانی گورنر جنرل عموماً فوج یا بحریہ سے لیا جاتا تھا۔اس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوتے تھے۔ہر محکمے میں ہر کام جاپان کی مرضی سے صرف جاپان میں انجام دیا جاتا تھا۔کوریا کے سارے انتظامی دفاتر میں چھوٹے سے بڑے ہر عہدے پر جاپان کا تقرر کیا گیا۔بیشتر کوریائی ملازمین برطرف کر دیئے گئے۔2,46,000 جاپانی کوریا میں کام کر رہے تھے۔اس طرح جاپان میں بے روزگاری کا مسلہ حل کر لیا گیا اور جاپانیوں کو اپنے ملک کے قریب ترین علاقے میں ملازمتیں حاصل ہو گئیں۔یہی صنعتی سرمایہ داری سامراجی نظام کا نہایت افسوناک پہلو ہے۔جب سرمایہ دار کے استحصال اور ظلم وستم میں ان کا متوسط اور مزدور طبقہ بھی شریک ہو جاتا ہے۔جاپان نے سب انتظامی، صنعتی، تجارتی اور زرعی امور کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔کوریا میں جاپانی فوج اور پولیس کے ہاتھ میں بڑے وسیع اختیارات تھے۔جاپانی پولیس کو سرسری عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے۔کوریا میں زمین داری نظام اسی طرح قائم تھا۔اب زمین دار جاپان کے ساتھ مکمل تعاون کر رہے تھے۔جاپان نے چاول کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔کوریا سے بیشتر چاول جاپان بھیج دیا جاتا تھا۔اس پالیسی نے کوریا کے غریب کسانوں کو تباہ کر دیا۔لاکھوں کسان فاقہ کشی سے بچنے کے لئے روزگار کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف جانے لگے۔جنگ چھڑ جانے کے بعد بیشتر جاپانی فوجی خدمت انجام دے رہے تھے۔اس لئے کوریا سے بہت سارے سستے مزدور بھرتی کر کے جاپان کی شکست کے بعد یہ 1945 میں کوریا واپس آئے۔کوریا میں سارا کاروبار اور صنعتیں جاپان کے ہاتھ میں تھیں۔ان اداروں میں بیشتر عہدوں پر جاپانی تعینات تھے۔جاپان نے کوریا کے وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا۔بڑی سے ریلیں، سڑکیں اور بندرگاہیں تعمیر کی گئیں۔'میت سوئی' اور 'میت سو بیشی' جیسی بڑی بڑی جاپانی کمپنیاں 1920 سے کوریا کی لیبر اور کوریا کے خام مال کو استعمال کر کے جاپان کی تجارتی ضروریات کا سامان تیار کر رہی تھی۔انہیں صنعتوں کے لئے تربیت یافتہ لیبر چاہیے تھی۔اس کے لئے انہوں نے کئی ادارے قائم کیے۔وہ ان جنگ کارخانوں میں انجینئر کی کمی ہو گئی۔اس کمی کو پورا

کرنے کے لئے کوریائی باشندوں کو تربیت دی گئی۔اس سے کوریا کو یہ فائدہ ہوا کہ جب جاپانی 1945 میں شکست کھا کر واپس چلے گئے تو کوریا کے انجینئر اور لیبران کارخانوں کو چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔اس سے کوریا کی تعمیر نو میں بڑی مدد ملی۔

بلا امتیاز رنگ ونسل اور مذہب وملک تمام سامراجیوں کی سوچ اور عمل یکسانیت ہوتی ہے۔ہر سامراجی اپنے کو عظیم سمجھنے کے متعدی مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔جاپانیوں نے بھی اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیمی نظام کو استعمال کیا اور کوریا کی نئی نسل کو یہ سکھانے کی کوشش کی کہ وہ جاپان کے غلام ہیں اور ہر اعتبار سے ان سے کم تر ہیں۔ذریعہ تعلیم جاپانی قرار دیا گیا اور تہذیبی غلامی کی ابتداء کی گئی۔چنانچے کوریا کو جلد از جلد زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی پالیسی نے ملک کی معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی کو مشکلات سے دوچار کر دیا۔اس سے کوریا کے کسان اور مزدور طبقے کو بہت نقصان پہنچا۔کیونکہ غیر ملکی سامراجی گدھ تو خون پی کر اور ماس کھا کر اڑ جاتا ہے۔اور محکوم ملک کے عوام کے دکھوں کا مداوا کسی کے پاس نہیں ہوتا۔جنگیں عورتوں اور بچوں کو جنسی غلامی کی ذلت اور اذیت دیتی ہیں۔کوریا کی ہزاروں عورتوں کو گرفتار کر کے جاپانی فوجی کمپیوں میں قید کیا گیا تا کہ وہ جاپانی فوجیوں کی جنسی ضرورت پوری کریں۔1945 کی جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد سے آج تک یہ عورتیں اور ان کے بچے جاپان کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں اور مقدمے لڑ رہے ہیں۔

کوریا کی تقسیم اور امریکی سامراج:

بیسویں صدی کے ایشیا کی سب سے بڑی انسانی ٹریجڈیوں میں سے ایک ٹریجڈی کوریا کی تقسیم ہے۔یہ تقسیم امریکی فوجی حکمرانوں کی بے رحمی اور بے حسی کی منہ بولتی تصویر ہے۔اس ٹریجڈی کے آئینے میں مستقبل کے ویت نام، فلسطین، لبنان، عراق اور افغانستان کو عکس دیکھا جا سکتا ہے۔بڑے سامراجی ملکوں کے فوجی افسر کس طرح چھوٹے ملکوں کی قسمت سے کھیلتے ہیں؟ کیسے کسی ملک کے کروڑوں انسان، زمین، دریا اور پہاڑ ایک قلم کی جنبش سے تقسیم کر دیے جاتے ہیں؟ پھر اتنا بارود اور اتنی نفرت بوئی جاتی ہے کہ آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی ملک کے متحد ہونے کے امکانات سرے سے مٹ جائیں۔کیونکہ یہ ابھی امریکی سامراجیت کی نئی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں ہے۔ہر بات کو جھوٹ اور فریب کے اندھیرے میں چھپانا ہر سامراجی کلچر کا سب سے بڑا سچ ہے۔

''واشنگٹن میں 10-11 اگست 1945 کی رات کو پینٹا گون کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کوریا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔وہ جانتے تھے کہ سوویت یونین شمال کے حصے پر قبضے کر لے گا۔اس لئے امریکہ نے جنوب پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ایک بیان کے مطابق دو سنیئر فوجی افسر جن میں سے ایک کرنل ''چارلس۔بون اسٹیل'' تھا...ایک ایسی صوبائی سرحدی لائن سیول کے شمال میں کھینچنا چاہتے تھے، جو کم سے کم سیاسی سرحدوں میں مداخلت کرے اور دارالحکومت سیول کو امریکی علاقے میں شامل کر دے۔فوری طور پر جو نقشہ انہیں ملا' وہ مشرق بعید کا ایک چھوٹا سا دیواری نقشہ تھا۔وقت بہت کم تھا۔''بون اسٹیل'' نے دیکھا کہ 38 پیرالیل لائن سیول کے شمال سے گزر رہی ہے اور کوریا کو تقریباً دو برابر حصوں میں تقسیم کر رہی ہے۔اس نے طے کر لیا کہ اسے دونوں علاقوں کی درمیانی سرحد مان لیا جائے.....یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک قوم کو ایک ایسی یک طرفہ میٹنگ کی بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا تھا، جہاں کوئی امریکی تھا ہی نہیں۔کوریا کی تو بات ہی نہ کریں، ان کے مفاد کی سرے سے نمائندگی ہی نہیں تھا۔لیکن اب اس سرحد پر کوئی شبہ نہیں تھا۔جرمنی کے برخلاف کوریا امریکہ کا دشمن تھا۔نہ کسی دوسرے ملک کا دشمن تھا۔وہ تو شکست خوردہ تو شکست خوردہ دشمن کی نوآبادی تھا۔اسے تو ایک فاتح ملک قرار دیا جانا چاہیے تھا۔اسٹالین نے امریکہ کی پرواہ نہیں تھی۔اسے اس سے زیادہ اہم مسائل درپیش تھے۔

12 اگست 1945 کو جاپان نے ہتھیار ڈالے تو پورے کوریا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔کوریا کے عوام کا خیال تھا کہ اب انہیں 35 سال غلامی کے بعد آزادی حاصل ہو گئی ہے۔لیکن سامراج اتنی آسانی سے کب مرتا ہے۔کئی محبّ وطن تنظیمیں اور چھاپہ مار گروپ طویل عرصے سے کوریا کی آزادی کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے تھے۔انہوں نے پورے جنوبی کوریا میں عوامی کمیٹیاں قائم کر لیں۔ان کمیٹیوں مین کسان، مزدور، طالب علم، ٹیچر اور سارے قوم پرست شامل ہو گئے تھے۔6 ستمبر کو عوامی جمہوریہ کوریا کے قیام کا اعلان کیا گیا۔اس کا دارالحکومت سیول تھا۔اس حکومت کے سربراہ قوم پرست لیڈر 'یو۔ان۔جیونگ'' تھے وہ جاپانی تسلط کے سخت خلاف تھے اور غیر جانب دار نظریات کے حامل تھے وہ روس اور امریکہ کسی کی بھی حمایت نہیں کرتے تھے۔

امریکی فوجیں 8 ستمبر کو ''ان چون'' کوریا میں اتریں۔اس فوج نے کوریا کے لئے کوڈ نام 'بلیک لیسٹ فورٹی' استعمال کیا تھا۔آج تک کوریا امریکہ کی بلیک لیسٹ میں شامل ہے۔امریکی جنرل ڈگلس مک آرتھر نے حکم جاری کیا کہ '38 پیر الیل لائن کے جنوب کا علاقہ میرے انظامی کنٹرول میں ہے اور اس علاقے کے سارے لوگوں کو میرے دستخط سے جاری کئے گئے احکامات پر عمل کرنا چاہیے۔' اس کے برعدس شمالی کوریا میں روسی فوج کے جنرل نے اعلان کیا تھا کہ کوریا کے سب قوم پرست، مزدور اور کسان اب ایک آزاد ملک کے شہری ہیں۔

امریکی سرمایہ دار حکم ران اور جنرلز، جرمنی و جاپان کی شکست اور یورپ کی تباہی کے بعد اپنی فوجی طاقت کے نشے میں دیوانے ہو گئے تھے اور ہر ملک میں من مانے جاہلانہ اور جابرانہ جیصلے کر رہے تھے۔کوریا میں تعینات امریکی فوج کا کمانڈر جنرل 'جون ریڈ حوج' کوریا میں قائم آزاد عوامی جمہوریہ کے سخت خلاف تھا۔اسے جنگ میں شکست کھانے والے جاپان سے بڑی ہمدردی تھی۔جنگ ختم ہونے کے بعد اب امریکی اعلی افسروں کی نظر میں جاپان دوست بن چکا تھا۔جاپان کی مخالفت کرنے والوں کو امریکی اپنا دشمن سمجھنے لگے اور کوریا کے غدار وطن دشمن جو جاپانی سامراج کے ساتھ تھے ان کو امریکی سامراجیوں نے اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔امریکی فوج کوریا کو اپنی نئے حاصل شدہ نوآبادی سمجھتی تھی۔اس نے کوریا سے وہی سلوک کیا جو غلاموں سے کیا جاتا ہے۔جنرل 'حوج' کا خیال تھا کہ صرف امریکی ملٹری آفس کو ہی کوریا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔اس نے 12 دسمبر 1945 کو قوم پرست کوریائی حکومت کو غیر قانونی قرار دے دیا۔اس نے سابق جاپانی گورنر جنرل 'نوبوپو' کی۔اے کو کوریا میں امریکی فوج کی جانب سے خدمت انجام دینے کے لئے عارضی سربراہ حکومت مقرر کیا۔اس کے علاوہ تمام جاپانی افسروں کو ان کے عہدوں پر بحال کر دیا گیا۔شہروں میں اس پالیسی کے خلاف ہینڈ بل تقسیم ہونے لگے۔'جاپانی پولیس مردہ باد، جاپانی پولیس کی ضرورت نہیں۔'

عوامی مزاحمتی تحریک:

پروفیسر جی۔ایم میکیون لکھتے ہیں کہ ''تحریک آزادی کی ابتداء اس دن ہو گئی تھی جب کوریا اپنی آزادی کھو بیٹھا اور پھر کوریا کے عوام کی زندگی میں سے وہ بہ حیثیت ایک منظّم تحریک اور ایک بااثر روحانی قوت، کبھی بھی ختم نہ ہو سکی۔کوریا کے تمام محبّ وطن جاپانی سامراج کی شکست کے بعد اپنے ملک کو آزاد اور خود مختار دیکھنا چاہتے تھے۔جنوبی کوریا کے مختلف علاقوں میں امریکی پالیسی کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔امریکی فوج کوریا کے قوم پرست اور محبّ وطن شہریوں کے خلاف کاروائی شروع کر دی۔شہروں میں ہڑتالیں ہونے لگیں اور کئی علاقوں میں منظّم بغاوتیں شروع ہو گئیں۔دیہی علاقوں میں کسان بڑے زمین داروں کے استحصال کے خلاف بغاوت کرنے لگے۔ان بڑے زمین داروں نے 35 سال کے دور غلامی میں ہمیشہ غیر ملکی جاپانی فوج کا ساتھ دیا تھا اور ان کے ساتھ مل کر اپنے ہم وطنوں پر ظلم کیا تھا۔اب جاپانیوں کی بجائے امریکی سامراجی ان کے سرپرست بن گئے تھے۔ستمبر 1946 میں 40,000 ریلوے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔وہ اپنے تین مطالبات....زیادہ سہولتوں، جمہوری اصلاحات اور امریکی ملٹری حکومت کے ظلم و تشدد کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔سارا جنوبی کوریا امریکی فوجی تاناشاہی کی دھاندلی اور ظلم ستم سے تنگ آچکا تھا۔جاپان کی شکست کے بعد عوام نے ایک خوشحال اور آزاد ملک کا جو خواب دیکھا تھا، وہ امریکی سامراجیوں نے چھین لیا تھا اور ایک نئی غلامی کی زنجیر ان کے گلے میں ڈال دی تھی۔عوام میں ان کے خلاف بے انتہا غم و غصہ تھا۔لاکھوں مزدور، طالب علم، چھوٹے دکاندار اور دفتروں کے ملازم بھی اس ہڑتال میں شامل ہو گئے۔امریکی فوج نے بڑی بے دردی اور درندگی سے عوام کے احتجاج کو کچلا۔اس جدوجہد میں ہزاروں کوریائی مارے گئے اور زخمی ہوئے اور ہزاروں گرفتار کر کے امریکی فوجی کیمپوں میں تشدد کا نشانہ بنائے گئے۔

شمالی کوریا میں بھی ملک کی آزادی اور تحفظ کے لئے عوامی کمیٹیاں قائم کی گئیں۔اکتوبر 1945 میں کم۔ال۔سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے کوریا کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک اجلاس 'پیونگ یانگ' میں منعقد کیا۔اسی سال دسمبر میں امریکہ روس اور برطانیہ کے وزراء خارجہ کا اجلاس ماسکو میں ہوا۔امریکہ کوریا میں ٹرسٹی شپ قائم کرنا چاہتا تھا۔لیکن روس کی تجویز، امریکہ اور روس کے ایک مشترکہ کمیشن کے تحت کوریا میں ایک متحدہ عارضی حکومت بنانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن جنوبی کوریا کے امریکی جنرل کا سیاسی ایجنڈا کچھ اور تھا۔

جنوبی کوریا:

غیر ملکی نسل پرست امریکی سامراجیوں نے دائیں بازو کے ایک امریکہ نواز

لیڈر سینگ من۔ری کو اقتدار دینے کا فیصلہ کیا۔امریکہ نے جنوبی کوریا میں فروری 1946 میں ایک کونسل قائم کی اور سینگ من۔ری کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔یہ کوریا کی تقسیم کی طرف پہلا قدم تھا۔دوسری طرف شمالی کوریا میں کمیونسٹ پارٹی مزدور اور کسان تنظیموں کو از سر نو منظم کر رہی تھی۔اس کا خیال تھا کہ عنقریب جنوبی کوریا کی قوم پرست سرکار اور شمالی کوریا مل کر ایک متحدہ ملک بن جائیں گے۔لیکن جب امریکہ کی فوج نے جنوبی کوریا پر سینگ من۔ری کی کٹھ پتلی سرکار مسلط کی، تو شمالی کوریا نے کم۔ال۔سنگھ کی چیرمین شپ میں ایک عارضی عوامی کمیٹی قائم کی۔اس سلسلے میں 'بروس۔کیومنگ' نے لکھا تھا کہ ''اس بات کا سرے سے کوئی ثبوت نہیں ہے کہ روس اور اس کے حامی فروری 1946 سے پہلے شمالی کوریا میں کوئی علیحدہ حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔''

امریکہ اور روس کا مشترکہ کمیشن موثر ثابت نہ ہو سکا۔روس نے اکتوبر 1947 میں یہ تجویز کی کہ کوریا سے ساری غیر ملکی فوجیں ہٹالی جائیں، تاکہ متحد ہو سکے۔لیکن امریکہ کو یہ علم تھا کہ کوریا کے تمام قوم پرست اور بائیں بازو کے عناصر غیر ملکی راج کے خلاف ہیں اور امریکی فوجوں کی بیساکھی کے بغیر سینگ من۔ری ایک دن بھی حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔چونکہ سیکورٹی کونسل میں امریکہ کو واضع اکثریت حاصل تھی۔اس لئے امریکہ اور اس کا پٹھو سینگ من۔ری اس مسئلے کو سیکورٹی کونسل میں لے گئے اور وہاں اقوام متحدہ کے تحت الیکشن منعقد کرنے کا فیصلہ کروایا لیا گیا۔امریکہ اور روس دونوں بہ خوبی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ امریکی اور روسی فوجوں کی موجودگی میں ایمان دارانہ اور غیر جانب دارانہ انتخاب نہیں ہو سکتے۔اس کے علاوہ جنوبی کوریا کی آبادی، شمالی کوریا کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔امریکی فوجوں کی موجودگی میں کوئی بھی قوم پرست اور کمیونسٹ جنوب سے منتخب نہیں ہو سکتا تھا۔اس کے واضع معنی یہ تھے کہ اس طرح امریکی منصوبے کے مطابق کوریا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا اور امریکہ مستقل اپنی فوجیں جنوبی کوریا میں رکھ کر پڑوسی ملکوں پر آسانی سے جارحانہ حملے کر سکے گا۔

مارچ 1948 میں جنوبی کوریا کی جز ب اختلاف کی سب پارٹیوں نے علیحدہ الیکشن کی سخت مخالفت کی۔لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود مئی 1948 میں صرف جنوبی کوریا میں الیکشن ہوئے۔امریکی آزاد جمہوریت کے علم بردار فوجیوں نے دھونس، دھاندلی، جعلی ووٹ اور رشوت کی مدد سے اپنے پٹھو سینگ من۔ری اور اس کے غدار ساتھیوں کو بھاری اکثریت سے منتخب کروایا اور ایشیا کو دکھا یا دیا کہ مغربی جمہوریت کسے کہتے ہیں۔جولائی میں ایک دستور بنا کر جنوبی کوریا میں امریکہ کی کٹھ پتلی سرکار کو پورے کوریا کی سرکار قرار دے دیا گیا۔15 اگست 1948 کو سینگ من۔ری صدر بن گیا کوریا میں فتنہ وفساد کے بیج بو کر امریکہ نے اپنی خاصی فوجیں ہٹالیں۔

شمالی کوریا:

1948 تک شمالی کوریا سے ساری روسی فوجیں جا چکی تھیں۔شمالی کوریا کے قوم پرستوں اور کمیونسٹ پارٹی کے سامنے بھی بے شمار مسائل تھے۔

1۔ کسانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے 5 مارچ 1946 کو 'شمالی کوریا میں زرعی اصلاحات کا قانون' نافذ کیا گیا۔بڑے زمین داروں کی زمین ضبط کر کے بے زمین کسانوں میں بانٹ دی گئی اور ان وطن دشمن بڑے زمین داروں کی مسلسل مذمت کی گئی جنہوں نے جاپانی سامراجیوں کے ساتھ مل کر اپنے ہم وطنوں کو نقصان پہنچایا تھا۔

2۔ جون 1946 میں ایک نیا لیبر قانون بنایا گیا۔مزدوروں کی ڈیوٹی کے اوقات آٹھ گھنٹے مقرر کئے گئے اور سوشل سیکورٹی کی سہولتیں دی گئی۔

3۔ سب عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں کام کی یکساں اجرت مقرر کی گئی۔عورت کو سماج میں مرد کے برابر درجہ دیا گیا۔نوزائیدہ لڑکیوں کو مار دینے اور جسم فروشی پر سخت پابندی عائد کی گئی۔

اپریل 1948 میں کم ال سنگ نے شمالی اور جنوبی کوریا کے تمام قوم پرست عناصر کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی۔اس میں جنوبی کوریا سے سینگ من۔ری کے سوا سب لیڈر شریک ہوئے۔اس کانفرنس نے متفقہ طور سے غیر ملکی فوج کے کوریا سے نکل جانے کا مطالبہ کیا اور صرف جنوبی کوریا میں علحدہ انتخابات کروانے کی سخت مخالفت کی۔مئی 1948 میں امریکہ نے جنوبی کوریا میں یک طرفہ ایکشن کروائے تو اس کے جواب میں شمالی کوریا نے اگست 1948 میں الیکشن منعقد کیے۔کم ال سنگ کی پارٹی کامیاب ہوئی۔نئی اسمبلی نے 9 ستمبر کو دستور بنا کر کم ال سنگ کو وزیر اعظم منتخب کر لیا۔نئی ریاست کا نام ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا (ڈی۔پی۔آر۔کے) رکھا گیا۔انہوں نے بھی پورے کوریا کی

نمائندگی کا دعوی کیا۔

پر فیسر کولین میکراز لکھتے ہیں کہ ''یہ بات خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ 1945 سے 1948 کے درمیان کے وہ سارے اقدامات جن کی وجہ سے کوریا کی تقسیم عمل میں آئی اور اسے قائم رکھا گیا۔ ہر بار یہ جنوب تھا جس نے پہلے قدم اٹھایا.... یہ امریکہ تھا جس نے ملک کو 38 پیرالیل لائن پر تقسیم کرنے کا یک طرفہ بیان جاری کیا۔ یہ امریکہ تھا جس نے جنوب میں کوریز پیپلز ری پبلک اور عوامی کمیٹیوں کو کچل دیا۔ یہ جنوب تھا جس نے پہلے فروری 1946 میں عارضی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ جنوب ہی تھا، جس نے 1948 میں ایک باقاعدہ حکومت قائم کرنے میں پہل کی۔

جنوبی کوریا میں سیاسی کشمکش:

سامراجیوں کی دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ دنیا کے لاکھوں انسانوں اور مالی وسائل کو قتل و غارت گری کی تجارت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔ سارے پرانے سامراجی برطانیہ، فرانس، نیدر لینڈ، جرمنی اور جاپان اپنی نو آبادیات کو قائم رکھنے کی صلاحیت اور قوت سے محروم ہو گئے تھے۔ اس جنگ کے بعد دو طاقتور ملک امریکہ اور روس ابھرے۔ امریکہ مارشل پلان کے ذریعے یورپ اور جاپان میں تعمیر نو کے بہانے اپنے مفادات کی حفاظت کر رہا تھا۔ اگست 1949 میں روس نے ایٹم بم کا تجربہ کیا تھا اور امریکہ کی ایٹمی ہتھیار پر اجارہ داری ختم ہو گئی تھی۔ مئی 1949 میں امریکہ اور یورپی ممالک کے درمیان ناٹو کا معاہدہ طے پا چکا تھا اور 1955 میں روس اور اس کے عورپی حلیفوں نے وارسا پیکٹ پر دستخط کر دیے۔ جنگ میں سب سے کم نقصان اٹھانے والا امریکی سامراجی جاپان کی شکست کے بعد سارے ایشیا کو اپنی نو آبادی تصور کر رہا تھا۔ اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد ایشیا میں خصوصاً مشرق میں دوررس تبدیلیاں ہوئی تھی۔ چین میں کومنتانگ' امریکہ کی زبردست مالی فوجی مدد کے باوجود شکست کھا چکا تھا۔ چین میں کسانوں اور مزدوروں کا عوامی انقلاب کامیاب ہو گیا تھا۔ چین کے انقلاب نے امریکی سرمایہ دار سامراجیوں کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ ویت نام اور انڈونیشیا کے عوام یورپی سامراجیوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مشرق بعید کے بیشتر ممالک میں سوشلسٹ اور قوم پرست غیر ملکی طاقتوں کے خلاف نہ صرف سیاسی بلکہ مسلح لڑائی بھی لڑ رہے تھے۔ ویت نام ہو کہ کوریا، ملایئشیا ہو یا فلپائن، انڈونیشیا ہو یا لاؤس و کمبوڈیا.... عوام نے ہر جگہ غیر ملکی استعمار کو چیلنج کر دیا تھا۔

کوریا کے طول و عرض میں ارض کوریا کے جن نثار سال ہا سال سے جاپان اور اب امریکی قابض فوجوں کے خلاف برسر پیکار تھے۔ سرکاری تشدد کے باوجود پورے جنوبی کوریا کے چھوٹے اور بڑے شہروں اور گاوں میں سیاسی مسلح جدوجہد جاری تھی۔ جنوبی کوریا کے مختلف شہروں اور بغاوتیں بھی ہو رہی تھیں۔ مثلاً .....اکتوبر 1948 میں جنوب کے ساحلی شہر بوسیو، میں امریکیوں کی ٹرینڈ کی ہوئی پولیس رجیمنٹ نے بغاوت کر دی۔ انہوں نے سوچون کے شہر پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے عوامی کمیٹیاں اور عوامی عدالتیں قائم کیں۔ 500 سپاہیوں اور افسروں وغیرہ پر مقدمہ چلا کر کچھ لوگوں کو موت کی سزائیں دیں۔ سرکاری فوج نے اس بغاوت کو بڑی بے دردی سے کچل دیا۔ 23,000 سے زیادہ لوگ گرفتار کئے گئے اور ان سے 80% کو سزائیں دی گئیں۔ بیشمار لوگوں کو موت کی سزائیں دی گئی۔ چے۔ جو۔ دو میں اپریل 1948 میں بغاوت ہوئی۔ اسے بھی بڑی سختی سے دبایا گیا۔ سرکاری فوجوں نے گاوں کے گاوں تباہ و برباد کر دئے۔

'جون حالی ڈے' اس صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ '1948 سے 1950 کے دوران جنوبی کوریا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک انتہائی جوش و خروش تھا۔ آمی بالکل قابل اعتبار نہیں تھی۔ مزدور اور کسان سب حکومت کے خلاف تھے۔ زبردست عوامی حمایت کے باعث چھاپہ مار ہر جگہ حملہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ سیول شہر میں سینگ من ری کی سرکار بھی ان کے حملے کے زد میں تھی اور اس کا جواب ظلم و تشدد سے دے رہی تھی۔ جب جنوبی کوریا کی قومی اسمبلی میں سینگ من ری کے مالی کرپشن پر تحقیقات شروع کی گئی، تو اس کی پولیس نے اسمبلی پر حملہ کر دیا۔ 22 آدمی گرفتار ہوئے، جن میں سے 16 لوگوں کی یا تو پسلیاں ٹوٹیں یا سر پر چوٹیں لگیں یا کان کے پردے پھٹ گئے۔'

کوریا کی جنگ 1950 سے 1953 تک:

پورے جنوبی کوریا میں سینگ من۔ ری کی سرکار کے خلاف سیاسی اور مسلح جنگ جاری تھی۔ مختلف شہروں اور گاوں میں مسلسل بغاوتیں ہو رہی تھی۔ شمالی کوریا 25 جون 1950 کو جنوبی کوریا کے عوام کی انقلابی جدوجہد میں شامل ہو گیا

۔سینگ من ۔ری کی نا اہل کرپٹ اور وطن دشمن سرکار کو ختم کرنے کے لئے تمام قوم پرست عناصر متحد ہو گئے تھے۔سیول پر شمالی کوریا کی انقلابی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔اور سرکاری فوجیں جلد ہی شکست کھا کر کوریا کے جنوب مشرق میں 'پو سان' تک دھکیل دی گئیں۔سارے جنوبی کوریا کے شہروں اور گاوں میں کسان ،مزدور اور قوم پرست عوام انقلابیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔امریکہ ری کی حکو مت ختم ہو جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔امریکہ نے 25 جون کو رات کے تین بجے سیکورٹی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کروایا۔روس،عوامی جمہوریہ چین کی بمائندگی کے مسئلے پر سیکورٹی کونسل کا بائیکاٹ کر رہا تھا۔سیکورٹی کونسل کے بقیہ اراکین امریکہ کے حامی اور طرف دار تھے۔سیکورٹی کونسل نے شمالی کوریا کے پرامن کو تباہ کرنے کا الزام عائد کر کے اپیل کی کہ جنوبی کوریا کی مدد کی جائے ۔برطانیہ کی تجویز پر 7 جولائی کو شمالی کوریا کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے اقوام متحدہ کی فوج تشکیل دینے کا فیصلہ کر لیا گیا اور ااامریکہ سے درخواست کی گئی کہ وہ اس کے لئے ایک امریکی کمانڈر مہیا کرے۔فلپائن کا شہرت یافتہ جنرل ڈگلس میک آرتھر اس فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔اقوام متحدہ کی فوج کی باقاعدہ تشکیل سے پہلے ہی امریکی نسل پرست سامراج نے اپنی ،بحری اور ہوائی فوجیں کوریا میں اتاریں۔

ابتدا میں شمالی کوریا کے انقلابیوں کے مقابلے میں اتحادی فوجیں پیش قدمی نہ کر سکیں۔میک آرتھر نے انقلابی فوج کے پیچھے 'ان چون' کے علاقے میں ایک بڑی فوج اتار دی۔اس اچانک حملے سے انقلابی پسپا ہونے پر مجبور ہوئے اور اکتوبر تک 38 پیرالیل لائن سے پیچھے ہٹ گئے۔امریکہ اور اس کے اتحادی برطانیہ ،کینیڈا،آسٹریلیا،نیوزی لینڈ وغیرہ اپنا مقصد حاصل کر چکے تھے۔لیکن اتحادی فو جوں نے جنگ بند نہیں کی۔امریکہ کی ٹرومین سرکار نے اس کامیابی سے مطمن ہو کر پورے کوریا پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔امریکی جنرل میک آرتھر چین کی سرحد تک سارے علاقے پر قبضہ کرنے کے بڑے بڑے دعوے کرنے لگا۔ستمبر میں چین کی طرف سے چواین لائی نے کئی بار یہ وارننگ دی تھی کہ 'چین اپنے بڑوسی ملکوں میں سامراجی وحشیانہ مداخلت برداشت نہیں کریگا'۔ادھر میک آرتھر پریس کانفرنسوں میں دعوئے کرنے لگا کہ نومبر تک شمالی کوریا فتح ہو جائے گا اور امریکی فوجیں کرسمس جاپان میں منائیں گی۔امریکہ کی غلام اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اتحادی فوجوں کو پورے کوریا میں 'متحد' آزاد اور جمہوری حکومت قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

اتحادی فوجیں 25 اکتوبر تک تیزی سے دریائے یالو تک پہنچ گئیں،جہاں کوریا اور چین کی سرحد ملتی ہے۔چین نے اپنے اعلان پر عمل کیا۔جلد ہی چین کے تین لاکھ فوجی اتحادی فوج سے جنگ کر رہے تھے۔میک آرتھر کی اتحادی فوجیں 38 پیرالیل لائن سے بھی نیچے دھکیل دی گئی۔اسی دوران نومبر 1950 میں ایک پریس کانفرنس میں صدر ٹرومین نے تسلیم کیا کہ اس جنگ کے ایک مرحلے پر کوریا کے خلاف ایٹم بم استعمال کرنے پر غور کیا گیا تھا۔میک آرتھر چین پر زبر دست ہوائی حملے کر کے اس جنگ کو چین تک پھیلانا چاہتا تھا۔لیکن امریکی سیا ست دان اور ان کے اتحادی چین کیساتھ ایک طویل جنگ نہیں لڑنا چاہتے تھے۔اپریل 1951 میں میک آرتھر کو ہٹا کر جنرل 'میتھیو۔ریج وے' کو اتحادی فوج کا کمانڈر بنا دیا گیا۔کچھ عرصے کی گھمسان کی جنگ کے بعد 38 پیرالیل لا ئن کے گرد جھڑپیں ہوتی رہیں۔جنگ جاری رہی اور لوگ مرتے رہے۔جولائی 1951 میں مذاکرات شروع ہوئے' جس میں امریکہ،روس اور چین کے علاوہ دونوں کوریا بھی شامل تھے۔جنگ بندی لائن اور قیدیوں کے تبادلے کے مسئلے پر سخت اختلاف رائے تھا۔آخر 27 جولائی 1953 کو صلح کے کاغذات پر دستخط ہوئے۔پیرالیل لائن کی بجائے نئی جنگی لائن تسلیم کر لیا گیا۔شمالی کوریا اور جنوبی کو ریا کی فوجوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے دونوں ملکوں کے درمیان ڈھائی میل کا غیر فوجی زون بنایا گیا۔اس جنگ میں تین لاکھ جنوبی کوریائی اور با ون ہزار شمالی کوریائی مارے گئے۔کوریا میں کی گئی یہ سیاسی تقسیم قائم رہی۔آج بھی جنوبی کوریا میں امریکی فوجیں ہیں اور ان کے فوجی اڈے برقرار ہیں۔اگر غیر ملکی فوجیں وطن کی زمین پر ہوں تو پھر آزادی غلامی میں بدل جاتی ہے۔دنیا کی کوئی قوم غلام نہیں بننا چاہتی۔عوام سے وطن کی آزادی کی جنگ لڑتے رہے ہیں اور آئندہ بھی لڑتے رہیں گے۔

تشدد کا جواب تشدد سے دے کر ظلم کے باب کو بند کیا جا سکتا ہے۔قراردادوں اور جلسے جلوسوں سے کبھی ظالم ظلم کرنے سے باز نہیں آتا۔۔(نیلسن منڈیلا)

قندیل ۔۔۔۔افسانہ

بانک کریمہ بلوچ

ہم امیدوں کے چراغ لئے اُس بستی کی طرف گامزن ہیں جہاں کے میٹھے چشموں کے پانی میں خون کی چیٹیں نہ ہوں ۔جہاں ننھے مردہ جسموں کے بوجھ سے بوڑھے باپوں کے کندے نہ جھکتے ہوں ۔جہاں بھوک وافلاس سے بھلکتے بچوں کی آنکھیں زندگی بھر کا درد بھرا سوال اپنی ماؤں کے لیے نہ چھوڑیں۔

وہ صدیاں جو انتظار کے تانے بانے میں مقفل ہوئی تھیں،،،اُنھیں کسی جوان پھول کے خون سے کھولا جاسکتا ہے۔۔:خون: جس کے بہنے سے کہیں خوشیاں منائی جاتی ہیں،تو کہیں آنسوں گراتی ہے۔۔۔ایک ہی خون کے گُہرے میں دو الگ خواہشوں کا جنم،،خواہشیں جو انسانوں کو تھوڑتی بھی ہیں اور جوڑتی بھی ،، جو تنہائی اور سیاہ کوٹھریوں میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔۔

میں جو ایک درخت کی مانند آندھیوں میں کھڑا تھا۔وہ مجھے ڈراتے تھے نہیں جھکوگے تو ٹوٹ جاؤ گے ،،،،،،اور میرا ایمان یہ تھا کہ اگر سقراط جھکتا تو مرجاتا،،،،،،،نہ جھک کر زہر کا پیالہ پی جانے کے بعد ہی امر ہو جاتا ہے،زندہ ہوجاتا ہے۔۔۔

سقراط کیا امر ہوئے کہ سچ امر ہوگیا۔۔

سچ کے نگہبان،سقراط کے سارے وارث ایک ایک کر کے اُٹھا لیے گئے، مارے گئے۔۔۔۔

مگر آزادی کے کچھ دیوانے اب بھی باقی ہیں۔۔

اب بھی کچھ پاگل لہو کے سرخ سمندر کے کنارے کھڑے اُس کشتی کا منتظر ہیں جس کے بادباں کو ہوا ہیں نہیں ،گمشدہ روحیں راستہ دکھاتی ہیں۔۔۔

آزادی کے وہ دیوانے اب بھی صحراؤں ،جنگلوں وادیوں میں بھٹکتے ہیں۔

جنہیں دیکھ کر شُبین ہوتا ہے کہ وہ نوید لے کر آرہے ہیں اُس انتظار کا جس کے دائروں میں صدیوں کی آرزوئیں از سرنو جنم لینے کے لیے تلملا رہی ہیں۔۔۔

باغ میں بیٹھے باغبان ہر پھول کے کُچلے میت کو دیکھ دیکھ سوچوں کے سمندر میں غرق ہیں۔۔۔۔

جو دستکوں سے نہ کھلنے والے صدیوں سے بند دروازے کے پیچھے چُھپے سوال کے جواب کو ڈھونڈنے کی راہ پر نکلے دیوانے آنکھوں کو چُبھ جانے والے خوابوں کے باوجود بھی خواب دیکھنے کے عمل کو چھوڑ نہیں دیتے کیونکہ جب خواب حقیقت کا روپ لیتی ہیں تب اُس چُبھن کی تکلیف بہُت چھوٹی نظر آنے لگتی ہے۔۔۔

دار پہ لٹکے گردن،،سر بریدہ جسموں کے انبار،، اُس انبار کے وارثوں کی درد میں ڈوبی سسکیاں،،،،،اُس دروازے کے کُھلنے کا منتظر ہیں جو مُصلحت ،مفاد،اور انا پرستی کے گرد میں دھمی ہوئی ہے۔۔۔

جب گرد ہٹائے جاہیں گے،

جب تقدیریں لکھی جاہیں گی،

جب ناانصافیاں انصاف اور جب ظلم عدل کے سامنے سر جُھکائے کھڑی ہوتب کیا ہوگا۔۔۔؟

نیند کے سرحدوں سے پرے آزادی وشادمانی کے زندہ خواب اُن کی جاگتی آنکھوں میں رقص کرتی پرتی ہیں۔وہ مقدس دیوی جس کا نام آجوئی ہے غلامی کی حولناک درد بھری تنگ وتاریک زنگ آلود پنجرے میں سہمی

ہوئی آنکھوں کے ساتھ اُن دیوانہ سروں کا منتظر ہے جو خون کے سمندر کے طوفانوں میں گری اُمیدوں اور حوصلوں کے کشتی کے مسافر ہیں۔
آجوئی کے وہ دیوانے شہزادے آئیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔مضبوط آہنی مقفل دروازے کے پیچھے سسکتی آہوں کی طرف،،،،،،
آرزوؤں کے دستک، خون میں ڈوبی، جلائی گئی، زنجیروں سے جکڑی گئی زخمی ہاتھوں کی دستک کی آواز پر کبھی تو رقصِ آزادی ہوگی۔
جب آہنی مقفل دروازے آزادی کی طوفان سے اُکھاڑ دیئے جاہیں گے ،تو، وہ برسوں کی سفر پر مُحیط ،منتظر، آنسوؤں کے آگ میں جُلسی ہوئی آنکھیں زندگی اور روشنی کا رنگ بھی دیکھیں،، وہ رنگ جسکا انتظار وہ اپنے جنم سے پہلے کررہے ہیں اورتب بھی وہ انتظار نہیں ٹوٹتا جب وہ سیاہ تنگ وتاریک گندی بدبودار کوٹھریوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں صرف اس لیے کہ اُنھوں نے اپنی آنکھوں میں آزادی کے خواب کیوں سجائے ہیں۔۔۔
آزادی جسکا آنا یقینی ہے۔۔۔۔۔روح کو محصور کرنے والی آزادی کی خوبصورت ،بالکل ویسے جیسے طوفانی بارش کے سب کچھ تہس نہس کرنے کے تھم جانے کے بعد جب قوسِ قزاع کے حسین رنگ زمین پر خوبصورت، رنگ بھرنگی پوشاک میں ملبوس پریوں کی طرح ناچتی ہوئی اُترتی ہیں۔۔۔۔
دریا، ندیاں پہاڑ، خون کا سمندر، ہرنگر، ہرگلی، اُن خوبصورت رنگوں کی آغوش میں ڈھل جائیں گی۔۔۔
یہ زمین بھی تو اُن سسکتی روحوں کا وارث ہے، یہ زمین بھی دیکھے گی آزادی کے رنگ، خون سے لت پت زمین، کیونکہ جب بھی کسی آزادی کے دیوانے کا سر بریدہ جسم ملا تو اسی زمین نے دامن پھیلائے اُسے اپنی آغوش میں لیا،، اور اپنے مہربان گود میں سُلایا۔۔۔
اِس زمین کو بھی حق ہے کہ وہ شادمانی کے دن بھی دیکھے،، وہ دن بھی جہاں اُس کے بچے جیئیں تو روشن آزاد فضاؤں کے آغوش میں۔۔۔وہ دن بھی دیکھے کہ جہاں اُسے ہر نئے دن کے ساتھ ایک نئے سر بریدہ جسم کا ماتم نہ منانا پڑے،،،،،،،اُس کی اشکبار آنکھوں کو کوئی اور منظر بھی نصیب ہو،، آزاد چمن کا منظر،،، محبتوں کا منظر،، محبت جو پانی کی طرح بہتی ہوئی آکر اُس کے قدموں میں تحلیل ہو جائے۔۔۔۔۔ اُس وعدے کا وفا بھی ہو جسکا وعدہ کیا اُن سے۔۔۔اُس کے دیوانے فرزند وہ وعدہ پورہ کریں گے،، وہ قدم جو اُٹھائے گئے ہیں اُن کی رفتار سرد نہیں پڑے گی۔۔۔ آزادی کا ملکہ غلامی کی خونین پنجرے سے آزاد ہوکر آزادی کے تخت پر سجے گا،، جس کا وعدہ کیا تھا اُسے پورہ کریں گے ۔

کسی بھی انقلابی جماعت کیلئے واضح دستورالعمل نہایت ضروری ہوتا ہے۔آپ کو ہرصورت علم ہونا چاہیئے کہ انقلاب کا مطلب اچانک غیر منظّم یا بیساختہ تبدیلی کے برعکس ایک منظّم اور باقاعدہ عمل کے ذریعے ارادتاً تبدیلی لانا ہے۔

﴿﴿ بھگت سنگھ ﴾﴾

چیئر مین گونزیلو۔۔۔کمیونزم کی چھارم تلوار

تحقیق وترجمہ وتبصرہ: جوان بلوچ

پروفیسر مینویل روبن ایمائیل گُزمن رینوسو سے لیکر چیئر مین گونزیلو تک کا سفر:

پروفیسر مینویل روبن ایمائیل گزمن رینوسو (Prof. Manuel Rube'n Abimael Guzmain Reynoso) کہ جنہیں چیئر مین گونزیلو (Chairman Gonzalo) بھی کہا جاتا ہے پیرو میں ہیومانگا یونیورسٹی (Huamanga University) کے فلسفے کے سابقہ پروفیسر اور مشہور زمانہ ماؤسٹ تحریک ''درخشاں راستہ ۔Shining Path'' کے رہنما بھی تھے ۔ تحریک درخشاں راستہ 1970ء کی دہائی کے آخری عرصوں میں نمایاں ہوئی اور اپنے مسلح جدوجہد کے سبب پیرو معاشرے میں وجہ بحث بنی۔گزمن کو پیرو سرکار نے 1992ء میں گرفتار کرتے سزائے عمر قید سنائی۔پیرو کے شہر لیما سے کافی قریب واقع ایک نیول بیس میں دوران اسیری اُن کی موت واقع ہوئی کہ جس پر یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اُنکی موت قطعاً طبی نہیں بلکہ دانستہ، ناقابل برداشت حد تک اذیت رسانی کے باعث ہوئی ۔ پیرو کے دائیں بازو کی سیاست کرنے والے سیاسی حلقوں کے مطابق چیئر مین گونزیلو کی گرفتاری کے بعد چونکہ مزاحمت مزید تیز ہو چکی تھی لہٰذا پیرو سرکار نے باغیوں کا حوصلہ پست کرنے کی خاطر چیئر مین گونزیلو کو موت کے گھاٹ اتارا۔

چیئر مین گونزیلو نظریاتی حوالوں سے اپنے زمانہ طالبعلمی میں ہی ایک سچے مارکسٹ و کمیونسٹ تھے ۔فلسفے کی ڈگری کے حصول میں لکھا جانے والا اُن کا مقالمہ (The Kantian Theory of Space & The Bourgeois Democratic Stat) بھی اسی نوعیت کا ہے۔

1960ء کی دہائی میں جب پیرو کمیونسٹ پارٹی (Peruvian Communist Party) نظریاتی وشخصی اختلافات کا شکار ہوئی تو چیئر مین گونزیلو نے بجائے روسی کمیونزم ڈھانچے کے چین کے ماؤسٹ طریقہ کار کو اپناتے پارٹی کو منظّم کیا اور پارٹی کو کسانوں کے حقوق کی تحفظ کی خاطر خالصتاً ماؤسٹ طریقہ کار کے تحت جدوجہد کرنے کی ہدایت کی ۔اُن کے حمایتی کارکنان نے اُنہیں کارل مارکس ،لینن اور ماؤ کے بعد کمیونزم کی چہارم تلوار (Fourth Sword of Communism) کا لقب دیا۔

وہ 1962ء میں ہیومانگا یونیورسٹی میں بحیثیت فلسفے کے پروفیسر متعین ہوئے ۔اس دوران انہوں نے طلبہ کو فلسفے کی تعلیم کیساتھ ساتھ معاشرے میں اُسکے اطلاق کی بھی ہدایت کرتے ،فلسفے کو محض دنیا کے بیان کرنے کا علم نہیں بلکہ اسکے بدلنے کا علم گردانا۔ اس دوران وہ خود بھی دائیں بازو کی سیاست کرنے والے اپنی تنظیم کی سرگرمیوں میں پیش پیش دکھائی دیئے۔

1965ء میں وہ پہلی بار چین گئے اور واپسی پر اُنہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں مزید تیز کر دیں۔1970ء میں وہ دومرتبہ گرفتار ہوئے اور اُن پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ حکومت مخالف مظاہروں وفسادات میں اُن کا ہاتھ ہے ۔اسی سال کے وسط میں اُنہوں نے یونیورسٹی میں پڑھانے کے سلسلے کو ترک کرتے مکمل طور سے روپوشی اختیار کی۔

اُن کی روپوشی کے بعد پیرو میں دائیں بازو کی سیاست کرنے والے لوگوں میں خاطر خواہ اضافہ دیکھنے میں آیا جبکہ اُن کی تنظیم ''درخشاں راستہ ۔ شائننگ پات Shining Path'' کے نام سے مشہور ہوتے پیرو سماج میں اپنی گہری جڑیں بنانے میں کامیاب ہوئی۔مئی 1980ء تک یہ تحریک اپنے گوریلا گروپ کے ساتھ حکومت کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑنے لگی اور جلد ہی پیرو کے مرکزی وجنوبی دیہی علاقوں میں اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہوئی ۔اس کے بعد یہ تنظیم مزید منظّم ہوتے لیما(Lima) شہر کے مضافات میں بھی اپنی کارروائیاں کرنے لگی۔

تحریک درخشاں راستہ کے ان جنگی کارروائیوں کا مقصد پیرو سرکار کو کمزور کرتے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔اس زمرے میں اُنہوں نے نہ صرف فوج وپولیس پہ بھرپور حملے کئے بلکہ ہر سطح کے اُن سرکاری ملازمین کو اپنا نشانہ بنایا جو پیرو سرکار کے حمایتی سمجھے جاتے ۔''سچائی وموافقت کمیشن'' نامی تنظیم کے مطابق اس تصادم و اختلاف کے پیش رو کوئی 70 ہزار افراد کی موت ہو چکی ہے ۔جس میں آدھے سے زیادہ افراد کی موت تحریک کے گوریلا جہد کاروں جبکہ باقی افراد کا قتل حکومتی کارروائیوں کے سبب ہوا ۔اس جنگ کے باعث مالی نقصان کا تخمینہ 30 ارب

امریکی ڈالر بتایا جاتا ہے کہ جسکے سبب پیرو اپنے معاشی ترقی کے رواں رفتار کی مناسبت سے 5 سال مزید پیچھے رہ گیا۔

درخشاں راستہ (Shining Path):

درخشاں راستہ یا شائننگ پاتھ پیرو کی ایک ماؤسٹ گوریلا مزاحمتی تنظیم ہے کہ جسے ''کمیونسٹ پارٹی آف پیرو۔PCP'' بھی کہتے ہیں۔شائننگ پاتھ کی بنیاد پیرو کے اندرونی سیاسی بحران کے سبب پڑی کہ جسکا مقصد بورژو طبقے کے ہاتھوں قائم کردہ جمہوریت کو ختم کرتے انقلابی سیاست کے تحت عام عوام خصوصاً محنت کش و کسانوں کے مفادات کا تحفظ کرنے والے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل سے بدلنا تھا۔ اُن کا یہ ماننا تھا کہ پرولتاری آمریت کیساتھ ساتھ ثقافتی انقلاب کے تحت اگر انقلاب برپا کیا جائے تو وہ حقیقی معنوں میں کمیونزم پر پہنچاتے عوامی فلاح وانسانی ترقی کے متعلق کچھ کرنے کے قابل بن سکیں گے۔اور اسی طریقے سے ہی حقیقی کمیونزم کی منزل حاصل کی جاسکیں گی۔اُن کا دنیا کی دیگر سوشلسٹ حکومتوں پہ یہ تنقید تھا کہ وہ محض چیزوں کو دہرائے جانے کے سبب عام عوام کو کمیونزم کے استفادے سے فیض یاب نہ کرپائے۔

انٹرنیشنلسٹ تحریکوں سے متاثر ایک ماؤسٹ جماعت ہے۔چونکہ تنظیم اپنے پختہ کمیونسٹ نظریات کے زیر اثر اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لینے کیلئے گوریلا جنگ میں مصروف رہی لہٰذا اس کے پر تشدد کارروائیوں کی سرمایہ دارانہ ممالک میں خوب مذمت کی گئی۔یہ تنظیم یورپی یونین، امریکہ اور کینیڈا بھر میں ایک دہشت گرد تنظیم تسلیم کی گئی۔ان ممالک میں اس تنظیم سے وابستگی واسکے لئے کام کرنے والوں کو مجرم و قانون کا منکر تسلیم کیا جاتا ہے۔

چند حقائق:

اس تنظیم کو عام فہم شائننگ پاتھ (Shining Path) یا اردو میں اگر کہیں تو ''درخشاں راستہ'' کہا جاتا ہے۔پارٹی کے ایسے انوکھے نام کی بڑی وجہ پیرو میں موجود نام نہاد کمیونسٹ جماعتوں کے نام سے قائم متعدد کاغذی تنظیموں کے سبب تنظیم کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے باعث رکھا گیا جیسے کہ اُن وقتوں پیرو میں کوئی 50 کے قریب کمیونسٹ جماعتیں تھیں۔یہ نام درحقیقت 1920ء میں پیرو میں قائم حقیقی کمیونسٹ پارٹی ''پیروین کمیونسٹ پارٹی'' کے سربراہ جوزی کارلوس "Jose Carlos Mariategni" کے الفاظ کہ ''مارکسزم اور لینزم ہی حقیقی انقلاب کے درخشاں راستے ہیں'' جیسے الفاظ سے نکلا۔اس تنظیم کے کارکنان کو عموماً سینڈرسٹاس (senderistas) کہا جاتا جبکہ یہ جماعت اپنے تمام تر انقلابی وسیاسی لٹریچر پہ اپنا نام کمیونسٹ پارٹی آف پیرو (PCP) ہی لکھا کرتی البتہ پیرو معاشرے میں کمیونسٹوں کی اس جماعت کو عام فہم شائننگ پاتھ ہی کہا جاتا۔

گوریلا جنگ:Guerrilla War

1980ء میں جب پیرو کی فوجی سرکار نے انتخابات کرائے تو شائننگ پاتھ بھی اُن جماعتوں میں سے ایک تھی کہ جس نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور اسی سال مئی کے مہینے میں اپنی گوریلا جنگ کا باقاعدہ آغاز کیا۔جس کا بنیادی مقصد یوں تو اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لیتے پیرو میں انقلاب برپا کرنا تھا۔مگر فوری مقاصد میں موجودہ انتخابات میں فوجی سرکار کو بے نقاب کرنے کے ساتھ اُسکے انتخابات کرائے جانے اور من پسند نمائندوں کو عوامی رہنما بنانے کی سازش کا بھی خاتمہ کرنا تھا۔اس مد میں اس تنظیم کی پہلی گوریلا کارروائی بھی اسی انتخابی عمل میں خلل پیدا کرنے کیلئے کی گئی کہ جس میں چوشچی (Chuschi) میں انتخابی سرگرمیوں کو سبوتاژ کرتے بیلٹ بکسز کو جلایا گیا، گوکہ وہ پوری طرح سے انتخابات کو ملتوی کرانے میں ناکام رہے مگر ایسی کارروائیاں کرتے وہ ملکی اخبارات میں جگہ بناتے عام عوام کے سامنے متعارف ہوئے۔

1980ء کی دہائی میں شائننگ پاتھ پیرو کے مختلف دیہی علاقوں میں کسانوں کی حمایت حاصل کرتے مزید مضبوط ہوئی اور ہر موقع کی صورت حکومتی رٹ وعملداری کو چیلنج کیا کرتی مگر اس کے باوجود بھی پیرو سرکار ایسی کسی مزاحمتی تنظیم کے وجود سے مکمل طور سے انکاری ہوتے خود کو اس صورتحال سے بیگانہ رکھے ہوئی تھی۔جب اس تنظیم کی گوریلا کارروائیوں کے باعث اسے عالمی شہرت ملنا شروع ہوئی تو پیرو سرکار نے اسے معمولی نوعیت کا اندرونی مسئلہ قرار دیتے سطحی مسائل کے ساتھ جوڑنا شروع کیا۔ان وقتوں کے پیرو سرکار کے وزیر داخلہ جوزی ماریہ ڈیلہ جارا (Jose Maria De la Jara) کے بقول یہ ایک ایسا گروہ ہے جو ریاست کو پریشان کرتے ذاتی نوعیت کے مفادات کے حصول کی تگ ودو میں چند لوگوں کو سرگرم رکھے ہے کہ جسکے ساتھ باآسانی مقامی پولیس کے ذریعے نمٹا جاسکتا ہے۔

29 دسمبر 1981ء کو پیرو سرکار نے شائننگ پاتھ کی تیزی سے بڑھتی مزاحمت کو کچلنے کیلئے ملک کے تین علاقوں کو ''ہنگامی خطہ۔Emergency Zone'' قرار دیتے سخت فوجی آپریشن کا حکم دیا کہ جس کے تحت ہر مشکوک فرد کو گرفتار کرتے مکمل جانچ پڑتال کی گئی۔اس فوجی آپریشن کے تحت پیرو سرکار پہ الزام لگایا گیا کہ یہ فوجی بر

بریت سے بھرپور ایسی سرکشی تھی کہ جس پر متعدد لوگوں کو نہ صرف تشدد کا نشانہ بناتے قتل کیا گیا بلکہ عورتوں کی بھی عصمت دری کی گئی۔ مقامی اطلاعات کے مطابق اس وحشیانہ کارروائی میں فوجی اپنے چہروں کو کالے نقاب سے ڈھکتے اپنی شناخت پوشیدہ رکھتے تاکہ اُنکے مجرمانہ فعل کا کبھی پردہ چاک نہ ہوجائے۔

اس فوجی بربریت کے ساتھ ساتھ پیروفوج نے مقامی کسانوں کے چندگروہوں کو بھی لالچ دیتے اپنے ساتھ کیا اور ان کی فوجی تربیت کرتے اُنہیں باغیوں کے خلاف لڑنے کی ترغیب دی۔ ان سرکاری کاسہ لیسوں کو ''رون ڈس۔ Rondas'' کہا جاتا جو حکومتی ٹکڑوں پہ پلتے مقامی انقلابیوں کی مخبری و براہ راست ان سے لڑنے کیلئے کمر بستہ تھے۔ اُن کی پہلی قابل بیان کارروائی جنوری 1983ء میں ہواٹا (Huata) کے قریب ہوئی کہ جہاں اُنہوں نے 13 سینڈرسٹاس (Senderistas) یعنی شائننگ پات کے مزاحمت کاروں کا گھاٹ لگاتے قتل کیا جبکہ مارچ 1983ء میں اُنہوں نے سیکسمارکا (Sacsamarca) میں لوکانہ مارکا نامی گاؤں کے کمانڈر اولیجیریو کیورٹیومے (Olegario Curitomay) کو بڑی اذیت دیتے شہید کیا۔ مستند ذرائع کے مطابق شائننگ پات کے اس مزاحمت کار کو جو اس مسلح مزاحمت کے دوران اک گاؤں کا فوجی کمانڈر بھی تھا اُسے پکڑ کر گاؤں کے بیچ چوراہے پہ لایا گیا اور وہاں اُس پر سنگ باری کی گئی، جسکے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں اس کے جسم پر نوکیلے ہتھیار گھونپتے اس کے زخموں کو مزید گہرا کرتے اُسے اذیت دیتے بالکل نڈھال کیا جس کے بعد اُسے نہایت بے دردی سے زندہ جلایا گیا اور آخر میں اُس پر گولیاں برسائی گئیں۔ شائننگ پات کے اس کمانڈر کی ایسی اذیت ناک موت دیکھتے پورے گاؤں میں دہشت کا اک ایسا سماں پیدا کیا گیا کہ لوگوں کے لبوں سے اپنے حقوق کی بات تو درکنار، اُس کے متعلق سوچنا بھی اک اذیت سے کم نہ تھا۔

اس سانحے کے فوری جواب میں شائننگ پات کے گوریلوں نے لوکانہ مارکا (Lucanamarca) سمیت مختلف گاؤں میں بڑی مستعدی کے ساتھ داخل ہوتے اپنے کمانڈر کی موت کا بدلہ لینے کی پیاس میں 69 ایسے لوگوں کا قتل کیا کہ جنکے متعلق یہ سمجھا جاتا کہ وہ براہ راست یا بلاواسطہ رون ڈس کیلئے کام کرتے ہوں۔ اس کارروائی کو بڑی حد تک تنقید کا نشانہ بناتے محض ایک ردعمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں شائننگ پات بنا کسی مؤثر اطلاعات کے دیوانہ وار لوگوں کا قتل عام کرتی رہی۔ اس نوعیت کے الزامات کو عموماً درست و جائز قرار دینے کیلئے پیرو سرکار شائننگ پات کی دوسری کارروائیوں کی مثال دیتی ہے جس میں ٹمبو ڈسٹرکٹ (Tambo District) میں 47 کسانوں کا قتل عام رون ڈس کے نام پہ کیا گیا کہ جس میں بدقسمتی سے 14 ایسے بچے بھی شامل تھے کہ جنکی عمریں محض 14 سال کے قریب تھی۔ اس کے علاوہ شائننگ پات کی گوریلا جنگ کو عمومی طور پر اس تنقید کا بھی سامنا رہا کہ یہ تنظیم اپنے مقاصد کے حصول و لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے اُنہیں سزائیں دینے سے بھی نہیں چوکتی، اس تنظیم پہ یہ الزام بھی بڑی شدت سے لگایا جاتا کہ اسکے ذاتی نجی جیل خانے بھی ہیں اور ساتھ میں لوگوں کو سزا کے طور پر یہ تنظیم کافی بیج (Coca) کی فصلوں پہ جبراً کام بھی کرواتی ہے کہ جہاں لوگوں کو ہفتوں بھوکا رکھتے جبراً کام بھی کروایا جاتا ہے اور اگر کوئی وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے بھی تو فوری سزا کے طور پر اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

بہرحال شائننگ پات ان الزامات کو یکسر رد کرتے اپنی جاری جدوجہد کو مزید تیز کرتی رہی اور اپنی کارروائیوں کا دائرہ کار بڑھاتے وہ دیہی علاقوں سے لیکر لیما شہر میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب ہوئی۔ 1983ء کے دوران شائننگ پات نے لیما کے انفراسٹرکچر کے ساتھ وہاں کے حکومتی حمایت یافتہ شہریوں کو بھی اپنا ہدف بنایا۔ اسکے علاوہ شہر کے مختلف بجلی کے ٹاورز کی تباہی کہ جسکے سبب پورے شہر میں بلیک آؤٹ ہوا کرتا، اک معمول سا بن گیا۔ اسی سال بائر صنعتی پلانٹ (Bayer Industrial Plant) کو بھی جلا کر خاکستر کرنے کی ذمہ داری شائننگ پات کے گوریلوں نے قبول کی۔ مزید برآں اسی سال حکومت میں شامل سیاسی جماعتوں کے دفاتر میں مختلف بم حملوں کو بھی اس تنظیم کی اہم کارروائیوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

1985ء میں لیما شہر میں اس تنظیم کی کارروائیوں میں مزید اضافہ ہوا کہ جس میں شہر کو مکمل طور سے تاریکی میں ڈوبنے کیلئے تواتر ٹرانسمیشن لائنوں کو بم دھماکوں سے اڑایا گیا۔ اس کے علاوہ سرکاری دفاتر بشمول عدالتوں کو کاربموں سے نشانہ بنایا گیا۔ جب پیرو کے صدر فرنانڈو بیلاونڈے ٹیری (Fernando Belaunde Terry) ارجنٹائن کے صدر کا استقبال کر رہے تھے تو اس موقع پر بھی لیما شہر بم دھماکوں سے گونج رہا تھا۔ اس پورے دورانیے میں مختلف رہنماؤں، دیگر دائیں بازو کی سیاست کرنے والی جماعت سے تعلق رکھنے والے کارکنان، مقامی سیاسی جماعتوں کے کارکنان کہ جن میں بیشتر کو اپنی سیاسی بصیرت کے تحت شائننگ پات کا

مخالف سمجھا جاتا قتل ہوئے۔اس کے علاوہ اُن غیر ملکی افراد کی بھی ایک فہرست تشکیل دی جاسکتی ہے جو پیرو میں ترقیاتی کاموں یا نجی حوالوں سے آئے تھے، جن میں امریکہ، اٹلی و پولینڈ کے بھی باشندے شامل ہیں جنکے قتل کے پیچھے شائننگ پات کا ہاتھ سمجھا جاتا ہے۔

اس تنظیم کی ایسی جارحانہ کارروائیوں کے باعث دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس تنظیم کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا کیا، جس پر اس تنظیم نے اپنا واضح موقف اختیار کرتے یہ وضاحت دی کہ:

''ہم انسانی حقوق کے عالمی ڈیکلیئریشن یا کوسٹاریکا کے تیار شدہ انسانی حقوق کنونشن یا سامراج کی مرتب کردہ اس نوعیت کی دیگر قانونی آلات (legal devices) کا پردہ چاک کرتے اُنکی مذمت کرتے ہیں۔ ہمارے مطابق اس نوعیت کی انسانی حقوق کے ضابطے خود لوگوں کے بنیادی حقوق کے متضاد و نفی ہیں۔ ہمارے مطابق انسان ایک سماجی شے ہے اور اُسکے حقوق، اُسکے سماج کی مناسبت سے ہیں جبکہ موجودہ استحصالی و استعماری نظام حکومت کے تحت انسانی حقوق کہیں وجود نہیں رکھتی ما سوائے ایک بورژوا (bourzeois) انسان کے دماغ کے جو اُس مقام پر ہے کہ جسے ہم جاگیرداری سے بھی اک مقام اگلہ کہہ سکتے ہیں۔ جیسے ماضی میں خودمختاری، مساوات و مذہب کو ایک سماجی آلہ (social device) کے طور پر استعمال کرتے محنت کشوں کا استحصال کیا گیا آج انسانی حقوق جیسے لفظوں کو بحیثیت قانونی آلہ (legal device) کے طور پر استعمال کرتے لوگوں کو اپنے بقاء کی جدوجہد کرنے سے دستبردار کیا جارہا ہے مگر آج چونکہ پرولتاری طبقہ منظّم ہوتے کمیونسٹ پارٹی کے زیرسائے فتح وانقلاب سے سرشار ہے اور وہ اپنے سماج کو سوشلزم سے تعمیر کرتے نئی جمہوریت یا پرولتاری آمریت سے تعمیر کرچکا ہے لہٰذا آج یہ سب پہ عیاں ہے کہ انسانی حقوق کا راگ محض ظالم حکمران طبقے و استحصال کرنے والے سامراجی ریاستوں کو محفوظ کرنے کیلئے گایا جاتا ہے۔ ہمارا موقف بالکل واضح ہے کہ ہم انسانی حقوق کے دعوؤں کو مسترد و نامنظور کرتے اُنکی سختی سے مذمت کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بورژوئی، رجعت پسند اور انقلاب مخالف حقوق کے سوا کچھ نہیں کہ جسے آج کے دور میں سامراج اور خصوصاً گورے سامراجی ممالک پرانے استحصالی نظام کو قائم و دائم رکھنے کیلئے استعمال کئے جارہے ہیں۔''

چیئرمین گونزبلو کا زندان سے خطاب:

چیئرمین گونزبلو کو 1992ء میں گرفتار کیا گیا۔ اسیری کے دوران جب اُنہیں تقریر کی اجازت ملی تو اُن کا تمسخر اُڑاتے اُنہیں قیدیوں کا لباس پہناتے اک پنجرے میں قید رکھتے دکھایا گیا۔ اس تضحیک واک عوامی قائد کی شان میں یوں گستاخی کے باوجود بھی گونزبلو نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے بہترین تقریر کی، اس تقریر کی اثرپذیری کے متعلق بعض کا کہنا ہے کہ اس کے سبب شائننگ پات بھرپور طاقت کے ساتھ ابھری کہ جسکا اثر زائل کرنے کی خاطر ہی چیئرمین گونزبلو کو دوران ایسی ختم کیا گیا۔ چیئرمین گونزبلو کی اس تاریخی تقریر کے ایک ہاتھ اقتباس کو شامل نہ کرتے باقی کی تقریر آپ قارئین کی نظر ہے۔

تقریر:

ہم تاریخی لحاظ سے نہایت اہم لمحات میں جی رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو موجودہ صورتحال کے پیش نظر ہر چیز واضح ہوجانی چاہیے۔ ہمیں کسی بھی لحاظ سے خود کو بے وقوف بننے سے روکنا ہوگا۔ موجودہ دور میں ہم سب پر یہ ذمہ داری عائد ہے کہ ہم سب اپنے ہمراہ تمام قوتوں کو متحرک کرتے مشکلات پر قابو پاتے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد کو برقرار رکھیں تاکہ ہم کامیاب و فاتح ہوں! اور یقیناً ہمیں یہی سب کرتے کامیابی سے ہمکنار ہونا ہے۔

ہمیں خود کو عوام کا نمائندہ اور خود کو اُنکی اولاد تصور کرتے اُن مورچوں پر اپنی جدوجہد جاری رکھنا ہوگی کیونکہ یہ بھی بالکل ایک جنگ کی طرح ہے اور ہم ایسا کریں گے کیونکہ ہم کمیونسٹ ہیں اور ہمیں بحیثیت کمیونسٹ ہر حال میں عوامی مفادات کیلئے اپنی جماعت کے اصولوں کی خاطر، اس عوامی جنگ کی خاطر یہ سب کرنا پڑے گا اور ہم یہ سب کر بھی رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

مجھے یہاں اس حال میں دیکھتے شائد کچھ لوگ سوچیں کہ یہ ایک عبرتناک شکست ہے مگر وہ خواب دیکھ رہے ہیں اور میرا اُن سے یہی کہنا ہے کہ آپ خواب دیکھتے رہیں! میں تو اسے، یا اپنی اس حالت کو چلتے کارواں و تحریک کا محض ایک موڑ سمجھتا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ ہمارا راستہ کافی طویل تو ضرور ہے مگر ہمارا منزل پہ پہنچنا بھی حتمی ہے۔ ہم ضرور فاتح ہونگے، ہم ضرور کامیاب ہونگے، آپ ضرور دیکھیں گے خود ایک دن، ضرور دیکھیں گے ایک دن.....

بس ہمیں اپنی آنکھیں موند کر اپنی تاریخ پر غور و فکر کرنے سے اجتناب برتنا ہوگا۔ ہمیں ہر حال میں حقیقت و سچائی کو پرکھتے آگے بڑھنا ہوگا۔ ہمیں اپنے وطن پیرو کی تاریخ پہ نظر ثانی کرتے اپنی جدوجہد کو درست سمت رکھنا ہوگا اور اس ضمن میں اگر ہم اپنی تین صدیوں کی تاریخ ہی اُٹھا کر دیکھ لیں تو ہر چیز کی وضاحت ہمیں اُس میں مہیا ہے۔

مثلاً ہم اٹھارویں صدی کی اپنی تاریخ میں دیکھ لیں، اُنیسویں وبیسویں صدی میں خود اپنا آپ دیکھ لیں تو ہر چیز کو سمجھنے کی وضاحت اسی میں ہمیں میسر ہے۔ جو لوگ آنکھیں موند کر اپنی تاریخ پہ نگاہ کرتے چیزوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں تو میرا اُن کے متعلق یہی کہنا ہے کہ نابینا لوگ کبھی ملک کی خدمت نہیں کیا کرتے، وہ کبھی پیرو کے سچے خدمت گار ہو ہی نہیں سکتے۔

اٹھارویں صدی کی ہماری تاریخ، ہمارے لئے اک واضح درس لئے ہوئے ہے۔ ذرا سوچئے اس صدی میں ہم پہ کوئی قابض تھا۔ یہ وہی اسپین تھا کہ جس نے ہمارا خون چوستے اپنے غلبے سے ہمیں غلام رکھا۔ اُسی نے ہی پیرو کو انتہائی پیچیدہ بحرانوں میں دھکیلتے اسے دولخت کیا کہ جس سے آج کے بولیویا (Bolivia) نے جنم لیا، گو کہ ہمارا بنیادی سوال یہ نہیں مگر یہ حقائق ہیں۔

اسی طرح آپ گزشتہ صدی کی ہماری تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں۔ ہم انگریزوں کے چنگل میں گرفتار ہوئے اور ہم پر انگریزوں کا غلبہ رہا۔ یہ ہمیں اپنی مسابقت کے باعث اپنے حریف فرانس سے الجھائے رکھنے کی وجہ بنا، جس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ..... چلی (Chile) سے جنگ..... ہمیں اسے قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان واقعات کے محرکات و پھر اُن کے نتائج کا تجزیہ کرنا چاہیے کیونکہ پھر کیا ہوا؟؟؟؟ ہم دوبارہ سے اپنے علاقے کھو بیٹھے! ہمارے محبوب رہنماؤں سمیت ہمارے لوگوں کا خون بھی بہا مگر اسکے باوجود بھی ہماری عوام کو شکست کا سامنا کرتے اذیتیں برداشت کرنا پڑیں ۔ہمیں ایسے سبق آموز تاریخی لمحات سے درس لینا چاہیے۔

آج یہ بیسویں صدی،،، کیا کر رہے ہیں ہم؟ اس بیسویں صدی میں بھی ہم سامراجی غلبے کے زیر اثر ہیں، خصوصاً امریکہ کی عطاء کردہ محکومی اور یہ بالکل واضح ہے۔ اب تو ہر کوئی یہ جانتا ہے اور یہ ہمارے ساتھ کیسے یا کیونکر ہوا؟؟ 1920ء کی دہائی کے بحرانی صورتحال جو پیرو کے لوگوں کی تاریخ کا سب سے بڑا بحران ہے اُسے بھلاتے ہوئے اور گزشتہ صدیوں کی اپنی تاریخ پڑھتے ہم کیا سوچنے پہ مجبور ہوتے ہیں؟ یہی کہ قوم ایک بار پھر خطرے سے دوچار ہے، یہ با آسانی بربادی کی جانب دھکیلا جا سکتا ہے۔ آج بھی بالکل وہی صورتحال ہے کہ جہاں ہمیں پہلے دھکیلا گیا تھا۔ مگر آج خوش قسمتی سے یہ بات بھی حقیقت ہے کہ ہم پیروین انقلاب کی جانب گامزن ہیں، جس کے لئے ایک عوامی جنگ جاری ہے اور یہ جنگ پیشگی سے جاری ہے، کوئی اگر پوچھے کہ اس جنگ نے ہمیں کیا دیا تو اس کا جواب یہی ہے کہ اس کے باعث ایک حکمت کے تحت توازن پیدا کیا گیا کہ جس نے بنیادی حالات کو استحکام بخشا۔ یہ 12 سال کس لئے لگائے گئے؟ شائد اس لئے کہ بڑی ضاحت سے یہ بات پوری دنیا، خاص کر پیرو کی عوام کے سامنے افشاں کی جائے کہ پیرو بحیثیت ریاست (میری مراد پرانے پیرو سے ہے) ایک کاغذی شیر ہے جو مکمل طور سے گل سڑ چکا ہے اور یہی ثابت ہوا۔

حالات اسی طرح ہیں کہ جیسے نشاندہی کی گئی ہے، ہمیں قوم کو درپیش خطرات کے متعلق سوچنا ہوگا، ہمیں اس پر غور وفکر کرنا ہوگا کہ ہمارا وطن پھر سے دولخت کیا جا سکتا ہے، قوم کو خطرات کا سامنا ہے۔ وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں، اسے تقسیم کر دینا چاہتے ہیں..... کون ایسا چاہتا ہے؟ وہ ہمیشہ کی طرح سامراجی طاقتوں کے سوا کوئی اور نہیں، وہ جو استحصال کرتے ہیں وہ جو حکمرانی کرتے ہیں اور اس کے بر خلاف اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ہمارے لئے یہی مناسب ہے کہ ہم عوامی آزادی کی اس تحریک کو اور آگے بڑھائیں کہ جسے ہم نے عوامی جنگ لڑتے منظّم کیا ہے کیونکہ ہمیشہ سے عوام ہی وہ طاقت رہی ہے کہ جس نے ملک کا دفاع کیا ہو۔

یہ وقت ہے کہ عوامی جنگ آزادی کے محاذ تشکیل دیئے جائیں۔ یہ وقت ہے کہ عوامی آزادی کیلئے لڑنے والے گوریلوں کو منظّم کرتے عوامی آزادی کی خاطر لڑنے والی فوج تیار کی جائے اور یہ نہایت ضروری ہے اور ہم ایسا کرینگے، ہم تو یہی سب کر رہے تھے۔ ہم ایسا ہی کریں گے، آپ حضرات خود اسکے گواہ ہونگے۔

آخر میں میرا یہی کہنا ہے کہ ہم دنیا کو اگر دیکھیں تو یہ سب پہ عیاں ہے کہ ماؤازم بنا رُکے، مارچ کرتا ہوا پرولتاری انقلاب میں نئی روح پھونک رہا ہے۔ غور سے سنیں اور سمجھیں جو کان رکھتے ہو، وہ ان کا استعمال کریں اور جو فہم رکھتے ہو وہ سمجھنے کی کریں .....ان کا استعمال کریں اور بند کریں اس حماقت کو، ختم کریں اس ابہام کو..... ہمیں اسے سمجھنے دیں..... ہمیں دنیا کو کس سے آشکار کرانا ہے؟ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے؟

ہمیں ماؤازم کے ساتھ معاشرتی ارتقاء کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے وہ حقیقی کمیونسٹ جماعتوں کو تشکیل دینے میں کامیاب ہو کہ جسکے ذریعے دنیا بھر میں آندھی کی مانند ابھرتے آنے والے پولتاری انقلاب کو منظّم کیا جا سکے۔

وہ ''موجودہ یا جدید دور کے فلسفہ امن'' کے نام پہ ہمیشہ سے کھوکھلی وفضول بکواس کرتے آئے ہیں۔ کہاں ہے یہ امن؟ یوگوسلاویہ میں کیا ہوا؟ دوسرے ممالک میں کیا ہوا؟ یہاں تو بس ہر چیز کو مدبر بناتے اُسے سیاسی رنگ دے دیا جاتا ہے جبکہ یہ

سب جھوٹ ہے اور اسکی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ آج اگر سچ کچھ ہے یا کہیں ہے تو وہ یہی کہ پہلی و دوسری جنگ عظیم کے بعد مسابقت کی دوڑ لگاتے ہماری یہ دنیا تیسری عالمی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہمیں تو یہ سب جاننا چاہیے کیونکہ ہم تو استحصال زدہ قوم کی اولادیں ہیں کہ جنکی حیثیت ایسی جنگوں میں محض لوٹ کا مال یا مالِ غنیمت سے زائد کچھ نہیں .....مگر اب ہم اسکی اجازت نہیں دے سکتے ، اس سامراجی استحصال کی اب کوئی منظوری نہیں۔ ہمیں اسے ختم کرنا ہوگا۔ ہم تیسری دنیا ہیں اور پوری دنیا کے پرولتاری انقلاب کی بنیاد تیسری دنیا میں ہوتی ہے۔ بس ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ کمیونسٹ پارٹیاں پورے سماج کو جھنجھوڑتے اُسکی رہنمائی کریں اور یہی ہمیں کرنا ہے۔

اگلے سال چیئرمین ماؤزے تنگ کی پیدائش کا سواں سال ہے۔ ہمیں ان سو سالوں کا جشن منانا ہے کہ جس کی منتظمیت کمیونسٹ پارٹیاں کریں، ہمیں ایک نیا انداز اپنانا ہے، ایک جشن کی صورت، جو دنیا بھر کے انقلابیوں کو شعوری طور پر چیئرمین ماؤ کی اہمیت متعلق آگاہی وفہم دے سکے۔ انقلاب کیلئے عالمی رائے عامہ پیدا کرنے کو ہمیں اس جشن کی افتتاح اسی سال کرتے اگلے سال تک جاری رکھنا ہوگا۔ یہ اک بڑے جشن کو منانے کا نہایت شاندار طریقہ کار ہوگا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے میں سلام پیش کرنا چاہونگا دنیا بھر کے پرولتاری (مزدور ومحنت کش طبقہ) طبقے کو، دنیا بھر کے محکوم اقوام کو اور دنیا بھر کی تمام انقلابی تحریکوں کو.....

یہ وہ کچھ ہے جو میں نے چاہا اور جسے باخوبی پورا کیا

سدا سلامت رہے پیرو کمیونسٹ پارٹی

عوامی جنگ کی فتح لازم ہو

سلام۔ مستقبل میں قائم ہونے والی عوامی جمہوریہ پیرو کو

شان ہو مارکسزم، لیننزم۔ ماؤازم کی

اور آخر میں کہوں تو

شان ہے پیرو کے عوام کی۔

تبصرہ وتنقید:

دورانِ تفتیش اک نوجوان لیفٹیننٹ نے چیئرمین گونزیلو سے پوچھا:

''اگر میں انقلاب برپا کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

چیئرمین نے جواباً کہا:

''تم میری لائبریری کیوں نہیں چلے جاتے کہ جہاں تم ابتداء ڈائی نیک فلسفے کی تاریخ کے مطالعے سے کرو، جو قطعاً مشکل نہیں، اسکے بعد تم مارکس ولینن کی 57 جلدوں پہ مشتمل تمام کتابیں پڑھ ڈالو کہ جس میں میرے پاس دو مختلف اشاعتیں بھی ہیں۔ اُس کے بعد تم اسٹالن کا مطالعہ کرنے بیٹھو جو قدرے آسان ہے، صرف 7 جلدیں اور آخر میں تم ماؤ کو سمجھنے کی کرو کہ جس کی قریب 4 جلدیں ہیں، گو کہ ایک پانچویں بھی ہے مگر وہ بعد کی ہے کہ جن پر نظر ثانی بھی کی جارہی ہے۔ اس کے بعد تم خود ہی جان جاؤ گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے!''

ایک ایسا سیاسی رہبر جو خود فلسفے کا پروفیسر ہونے کیساتھ ساتھ اقوام عالم کے طبقاتی جدوجہد کی مکمل تاریخ سے آگاہ ہو، کہ جسے اپنی پیروین تاریخ پہ اس قدر عبور حاصل ہو کہ وہ روانی کیساتھ کسی سے گفتگو یا اپنی تقریر میں موضوع کی مناسبت سے تاریخی حوالہ جات دیتے اپنی پیش کردہ منطق کو پختگی بخشنے کا کمال رکھتا ہو یا ایسا رہبر جو اپنے سیاسی موقف پہ زمانہ طالبعلمی سے اس قدر گرفت رکھتا ہو کہ اپنے فلسفے کی ڈگری کے حصول کیلئے لکھے جانے والے مقالے کا عنوان بھی اپنے سیاسی نظریات سے مماثل چننے کے بعد اس پر کڑی نکتہ چینی کرنے کیلئے دنیا بھر کے دانشوروں کو دعوت دیتا ہو، ایسا معلم جو نہ صرف فلسفہ پڑھاتا ہو بلکہ اس مضمون کے عظیم مفکروں کی طرح اپنے اس علم کو محض دنیا کے سمجھنے کے علم کے بجائے اسے بدلنے کا علم گردانتا ہو اور اس کے لئے وہ خود بھی عملاً یونیورسٹی کے کمرۂ جماعت سے لیتا طلبہ کی نجی نشستوں میں بیٹھتے اُنہیں درس دیتے انقلاب کیلئے ذہن سازی کرتے نوجوانوں کو مسلح مزاحمت کیلئے تیار کرتے خود اُن کی کمان سنبھالتا ہو۔ اک ایسا انسان کہ جس کی مجموعی شخصیت کو ہم انگریزی ادب کی مناسبت سے "Paragon of Virtue" یعنی ''خوبیوں یا کمالات کا مجموعہ'' کہے، ایسے انسان پہ تنقید کرنے کیلئے اصولاً تو اُسکے مرتبے تک پہنچنا چاہیے مگر عظمت کے اس معراج پہ چڑھنے کا حوصلہ رکھے بنا میں ایسے اخلاقی قدروں کو نظر انداز کرتا چند تنقیدی نکات پہ تبصرہ کرتے محکوم اقوام کی جدوجہد کو مزید مستحکم کرنے کی غرض سے اُن کیلئے کچھ تحریر کررہا ہوں اور یہ سب کرنے کا اخلاقی جواز بھی مجھے چیئرمین گونزیلو کے اسی بیان سے ملا جو اُنہوں نے پارٹی کے پہلے سنٹرل کمیٹی کے اجلاس کے دوران کہی:

''تنقید اور خود تنقیدی ایک ماؤسٹ مشق و انقلابی عادت ہے کہ جسکی بدولت بُری عادتوں خصوصاً دہرائی جانے والی غلطیوں کی عادت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔''

اپنے مضمون کے اس پس منظر کے بعد میرا پہلا تنقیدی فقرہ چیئرمین گونزیلو کی

جارحانہ پرتشدد کارروائیوں سے منسلک ہے کہ جسکی دلیل وہ عموماً اپنے ماؤسٹ نظریہ کے تحت دیتے رہے اور اگر اس تنقیدی نقطے کی مزید کوئی وضاحت کرے تو یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ وہ تشدد کے بے دریغ استعمال کو کبھی بھی برحق ثابت نہ کر سکے اور اپنے پہ لگے الزامات کو محض جھٹلاتے گئے حالانکہ بحیثیت ایک سیاسی مفکر و رہبر، آپ کو اس بات کا باخوبی علم تھا کہ انسانی حقوق کے بنائے ضوابطوں کو سامراج ایک منطقی نقطہ بتاتے تحریک کو نقصان دے سکتا ہے یا اسے خود پہ براہ راست حملے کا جواز بنایا جا سکتا ہے مگر آپ نے فقط اپنے اشترا کی خیالات کہ جنہیں پہلے سے ہی سامراجی ممالک و طاقتیں ناپسند کرتے جھٹلاتی ہیں، محض اُنہی کا اظہار کرتے ممکنہ خطرے کو بدستور نظر انداز کیا جبکہ ہم دنیا کی دیگر تحریکوں کا مطالعہ کرتے یہ با آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ مسلح جدوجہد میں مزاحمتی فکر کو دہشت گردی سے ممتاز رکھنا موجودہ دور میں ایک اہم سیاسی حکمت عملی ہے کہ جس میں چند اہم نکات کا جائزہ ناگزیر ہے، جیسے دنیا کو یہ باور کرانا انتہائی ضروری ہے کہ اُن کی مسلح جدوجہد کا مقصد اُن کے جائز مطالبے کو منوانا ہے جو یقینی طور پر اس قدر آفاقی ہے کہ جس کے لئے ہتھیار اٹھانا یا جان دینا خود انسانیت کی خدمت و اُسکے تحفظ کے زمرے آئے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سوشلزم کا پرچار کرتے مظلوموں یہ جماعت اپنی ساری جدوجہد محض پیرو میں سیاسی طاقت کے حصول پر مرتکز کرتی اس قدر دیوانہ وار ہوئی کہ اس نے اپنے اہم ہدف (غیر طبقاتی یا مساوی معاشرہ۔Class less society) کیلئے عوام کو آمادہ کرنے کے بجائے محض طاقت کی سیاست (اقتدار کا حصول) کی خاطر دہشت گردانہ رویہ اپناتے معاشرے میں بجائے مارکسی نظریات کے پروان چڑھانے کے متضاد، دہشت و خوف سے لوگوں کو ہراساں کیا، جبکہ خود مارکسٹ تحریکوں میں بھی اس نوعیت کے مطالبات ایک بڑے مقصد کا جُز ہوتے ہیں اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جہاں مقصد کم اہم اور مطالبات اہم ہو جائیں وہاں تحریکیں معاشرے میں کوئی بنیادی تبدیلی لانے کے بجائے محض سطحی کامیابیاں حاصل کرتے لوگوں کو مایوس کر دیتی ہیں۔ اس زمرے میں ہم غوث بخش بزنجو کے بلوچ سیاست میں مقصدیت کی سیاست (جو یقینی طور پر بلوچ عوام کی اُمنگوں کے تحت قومی آزادی تھی) کو قومی کمزوریوں کی نسبت کم اہم پیش کرتے مطالبات کی سیاست (مقبوضہ بلوچستان کو پاکستانی صوبہ تسلیم کرتے پاکستانی سیاست کا حصہ ہوتے وزارتوں کے حصول) کو پروان چڑھاتے انقلابی رجحان کے خاتمے سے غلامانہ ذہن و خیالات کو تقویت دینے سے سمجھ سکتے ہیں۔

بہر حال شائننگ پات کے بیان کردہ تنقیدی نقطے پہ اگر دوبارہ لوٹیں تو یہ بھی کہنا غلط نہیں کہ تشدد کو جائز جدوجہد کے تناظر میں ایک حکمت عملی کے طور پر اپناتے اسے خصوصی طور پر قابض یا خود پہ غلبہ رکھنے والی طاقت کے برخلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر پیرو میں چلنے والی اس عوامی تحریک پر عام عوام پہ ہلہ بولنے کے الزامات ہیں۔ جن کی صفائی میں محض انسانی حقوق کو سامراجی ہتھکنڈہ کہتے جان چھڑائے جانے کی ہٹ دھرمی کی گئی۔

اس زمرے میں تنقید کا اک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک طرف جہاں اپنے پر عائد الزامات سے راہ فرار اختیار کی گئی تو دوسری جانب ایسی کارروائیوں میں بھی اضافہ ہوا جو واضح طور پر ایسے الزامات کی صحیح کرتی ہے۔ اسکی مثالوں میں لوگوں کی انفرادی آزادی چھیننے الکوحل کی ممانعت کے فیصلے سے لیکر لوکانہ مارکا وٹمبو ڈسٹرکٹ میں قتل عام کی کارروائیاں شامل ہیں کہ جسمیں 14 بچوں کے قتل عام کے ساتھ عورتوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ ابھی اس سانحے کے جواب میں پارٹی متعدی سے اپنی صفائی دے ہی نہیں پائی تھی کہ 1992ء کا ربم دھماکے نے ایک اور عالمی تنقید کے تیر کو اپنا سینہ دکھاتے مشتعل کیا۔ یہ بم دھماکہ لیما شہر کے سب سے مصروف ڈسٹرکٹ کی مصروف ترین شاہراہ پر ہوا کہ جس کے باعث متعدد معصوم افراد کی بھی جانیں گئیں، گو کہ یہ دھماکہ حکومت کو مالی نقصان دینے کی خاطر کیا گیا مگر معصوم انسانوں کی شہادت نے تحریک پہ سوالات اٹھانے کی راہ ہموار کی۔

اس نقطے کو اگر بلوچ مزاحمتی تحریک کے مقابل دیکھیں تو یہ نہایت خوش آئند ہے کہ بلوچ مزاحمتی تحریک اپنی مظلومیت سے دنیا بھر کو آشکار کرتے باخوبی سے خود کو انسانی حقوق کے عالمی اصولوں کے مطابق رواں دواں رکھے ہوئے ہے، گو کہ یہ تحریک خود پہ بربریت کا منظّم پرچار نہیں کر پائی مگر عالمی تناظر میں سرگرم ہوئی انسانی حقوق کی تنظیموں کو مظلوم و ظالم کے فرق کرنے میں کوئی خاص دقت بھی نہیں اور میرے نزدیک اسکی اہم وجہ بلوچ تحریک میں تشدد کا منصفانہ استعمال ہے مثلاً عام بلوچ عوام جو یقینی طور سے اپنی مظلومیت کے باعث اپنے سرمچاروں سے زیادہ پر تشدد کارروائیوں کا مطالبہ کرتی ہے لیکن ایسے جذباتی مطالبات سے درکنار بلوچ مسلح جہد اپنے عام عوام کی اُمنگوں کے بجائے سیاسی حکمت عملی کے مطابق ہی اپنی کارروائیوں کی شدت کنٹرول کئے ہوئے ہے اور اسی وجہ سے ہی عام عوام کے بیچ عموماً تحریک کو کمزور بھی سمجھا جاتا ہے مگر گہرائی سے مطالعہ کرنے پر یہ بات خود عیاں ہوتی ہے کہ اس طویل مدتی مسلح مزاحمت میں بلوچ سرمچاروں نے بلوچستان بھر میں وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی کا احساس دلاتے نہ صرف بین الاقوامی صنعتی منصوبوں کو ناکام کیا کہ جن

سے پاکستان کثیر زرمبادلہ کماتے بلوچستان بھر میں آبادکاروں کی سکونت کا اپنا منصوبہ پورا کرنے کیلئے کثیر سرمایہ یکجا کرنے کی اُمید رکھے ہوئے تھا بلکہ گیس و دیگر معدنیات کے اُن منصوبوں کو بھی برابر نقصان پہنچایا کہ جس کی نیف پر پاکستانی معیشت ٹکی ہے۔۔شائننگ پات، بلوچ قومی تحریک کے اس تقابلی جائزے میں یہ نقطہ ممکن ہے کہ کسی حد تک دونوں تحریکوں کے مقاصد واہداف کے فرق کے باعث جائز نہ لگے، مگر حقیقی صورتحال ایسی ہی ہے کہ جیسے بیان کی گئی ہے۔

مزید برآں اگر ان دونوں تحریکوں کو درپیش دشواریوں کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی سیاسی موقف کے اہم فرق کے باوجود دونوں تحریکوں کو درپیش دشواریوں کے علاوہ کاؤنٹرانسرجنسی کے اپنائے ہوئے ریاستی حکمت عملیوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے اور جس میں ایک چند تو اتنی مماثل ہے کہ جس پر تبصرہ کرنا میں خاصا سودمند سمجھتا ہوں۔اس مشابہت میں ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچ مزاحمتی علاقوں میں پاکستان کی جانب سے قائم کردہ (mercenaries) یعنی ذرطلب یا کرائے کے فوجیوں کہ جنہیں اخلاقی پیرائے میں پیش کرتے عموماً مذہب و پاکستانیت کے القاب سے شناخت دی جاتی ہے۔پیروین کاؤنٹرانسرجنسی کی ہوبا ہونقل ہیں۔بلوچ معاشرے میں اپنی تحریک کو کچلنے کیلئے قائم کردہ ان مسلح تنظیموں کو دیکھ اک عام بلوچ شائد یہ گمان کرتا ہو کہ یہ نسخہ پاکستان کی اپنی غاصبانہ ایجاد ہے مگر یہ قطعی درست نہیں بلکہ مظلوموں کے حالات میں یکسانیت کے باعث استحصال کے طریقوں سے لیکر قوموں کو دبائے جانے کے طریقہ واردات میں بھی ایک مماثلت ہے اور ہم ایسی ہی مماثلت سے ایسا علم یکجا کرسکتے ہیں کہ جس سے بلوچ قومی تحریک کو مضبوط کیا جاسکے ، پیروحکومت نے بھی شائننگ پات جیسی عوامی تحریک کو کچلنے کیلئے مقامی کسانوں کا استعمال کیا۔

پیروسرکار کی اس مد میں کاؤنٹرانسرجنسی کے طرقہ واردات کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ریاست نے شورش زدہ علاقوں میں بڑی مکاری کے ساتھ مقامی کسانوں کو لالچ دیتے شائننگ پات کے گوریلوں سے لڑنے کیلئے مسلح کرتے اُنہیں فوجی تربیت و معاونت فراہم کرتے کوئی 7226 کمیٹیاں تشکیل دی کہ جنہیں ''کمیٹی برائے ذاتی تحفظ۔Committes of self-defence'' کا لقب دیا گیا۔یہ کمیٹیاں (تحریک کو کچلنے کیلئے سرکار کی جانب سے قائم کردہ مسلح تنظیمیں) بالکل بلوچستان میں قائم پاکستان کی بنائی گئی مسلح تنظیموں کی طرح اپنی خدمات پیش کرتی کہ جن میں حقوق کی خاطر لڑنے والے باغیوں کی مخبری، اُنہیں ختم کرنا و مسخ شدہ لاشیں پھینک کر خوف وہراس پھیلاتے لوگوں کے حوصلے پست کرنا شامل تھی، گوکہ بلوچستان میں سرمچاروں کے مقابل پیدا کردہ مقامی سرکاری طاقت اخلاقی اعتبار سے اسقدر مضبوط نہیں جسکے باعث پاکستان بھی اُن کی پشت پناہی کیلئے بین الاقوامی طور پر کوئی مروجہ دلیل پیش کر پائے لہٰذا یہ تنظیمیں سرد جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوئے مذہبی پروپیگنڈے کو ڈھال بناتے کبھی خود کو اسلام کے مجاہد تو کبھی حکومتی سطح پر پیدا کردہ بھارت وامریکہ مخالف رجحان کا سہارا لیتے خود کو پاکستان کا دفاع کرنے والے محافظ پکارتے ہیں جبکہ پاکستانی فوج بھی انہی کے ناموں کو استعمال کرتے براہ راست ایسی بلوچ مخالف وانسانیت دشمن کارروائیوں کو انجام دیتا ہے کہ جن پر انسانی حقوق کی پامالی کے متوقع الزامات لگنے کا خطرہ ہو۔اس نیت سے پاکستان خود کو عالمی سطح پر ایسے انسانیت سوز عمل سے خود کو بری الزمہ قرار دیتے یا ایسے الزام کے ممکنہ نتائج کے تحت ہونے والی سزا سے خود کو مستثنیٰ رکھنے کی سوچ پر عمل پیرا ہوئے بلوچ مزاحمتی تحریک کو کچلنے کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے اور یہی بات بلوچ تحریک کے سرخیل سیاسی رہبروں کیلئے قابل غور ہونی چاہیے کہ وہ پوری قوت سے دنیا بھر میں اس سازش کا پردہ چاک کریں تاکہ دنیا کو یہ سمجھنے میں کوئی ابہام نہ ہو کہ بلوچ تحریک کو کچلنے کی غرض سے قائم کردہ یہ مسلح جماعتیں کوئی تیسری قوت یا عوامی حمایت یافتہ نہیں بلکہ خود پاکستانی فوج ہی ہے۔

Simply, an unofficial recruited army that used to hold the image of regular army as civilized or islamic, although the both are more barbarian than Nazi regiume.

ایک ایسی فوج جو خود اپنی خودساز عدلیہ ومیڈیا کو اپنا ادارا جاتی انگ تصور کرتے انسانی حقوق کے تمام ضوابط کو روندنے کے باوجود خود کو پاک ومقدس اسلامی فوج کہلائے جانے سے بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتی اور اسی غرض سے ہی وہ کچھ زرخرید بلوچوں کو طاقت بخشتے اُنہیں ایک مقامی تنظیم کا روپ دیتے اپنی اُن کارروائیوں کیلئے بھی اُن کا نام استعمال کرتی ہے کہ جن پر انسانی حقوق کی پامالی کے الزامات لگنے کا شدید خطرہ ہو اور یہ سب صرف بلوچوں کے ساتھ نہیں، پاکستان کی کل تاریخ چونکہ مظلوم قوموں کو کچلنے پر مبنی ہے لہٰذا ال شمس، البدر جیسی تنظیمی مختلف ناموں کے ساتھ مختلف جگہ بنائی گئی کہ جنہیں عموماً بنگالی دانشور (Shadinota Birodhi Shokti) یعنی ''آزادی مخالف قوتیں۔Anti-liberation Force'' پکارا کرتے تھے۔

مختلف تنقیدی مکالموں میں چیئرمین گونزیلو پر سرکاری پروپیگنڈے کے تحت عموماً نقاد پہ نقطہ بھی پیش کرتے ہیں کہ غریب عوام کی بات کرنے والا یہ پیروین قائد، پیرو کے کسانوں وغریب طبقے کو سرکار سے نبرد آزما کرتے خود لیما جیسے شہر کے ایک شاندار فلیٹ میں اپنے قریبی رفیقوں کے ہمراہ آرام کرتے گرفتار ہوا۔ اس طرح کی سطحی تنقید کو میں اپنے اس تحقیقی مکالمے میں ہرگز جگہ نہ دیتا مگر یہ الزام چونکہ جلاوطن ہوئے ہمارے قومی رہنماؤں پر بھی عموماً لگایا جاتا ہے لہٰذا اس مماثلت کے تناظر میں مجھے ہر قاری کو اس بات کی وضاحت دکھانا تھی کہ کیسے استحصالی طاقتیں قومی رہنماؤں کے تشخص کو پامال کرنے کی خاطر الزامات کا کھیل کھیلا کرتی ہے۔ اس تناظر میں مجھے جلاوطن ہوئے بلوچ قائدین کو اس بات سے بھی تنبیہہ کرنا ہے کہ وہ ایسے طفلانہ الزامات پر جواب دیتے کبھی یہ پیغام نہ دیں کہ چونکہ اُن کی جان کو خطرہ تھا لہٰذا وہ محض خود اپنی ذات کو محفوظ کرنے کی خاطر ملک بدر ہوئے کیونکہ اس سے ایک عام بلوچ کو یقیناً یہی تاثر جائے گا کہ قومی جدوجہد کیلئے جنگ زدہ علاقوں و وطن سے دور جانا ہی ضروری ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ بھی رہے ہیں کہ بلوچ سیاسی حلقوں میں موجودہ دنوں نوجوانوں کا وطن چھوڑنا بہ نسبت خود کو محفوظ رکھتے سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے سے بھی زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ اس زمرے میں ہمارے قائدین زیادہ بہتر موقف اختیار کرتے ''سانپ بھی مرے ولاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' والی ترکیب کر سکتے ہیں جو زیادہ موزوں و (slight of cadet captial or force) جیسے تخریبی رجحانات کو فروغ پانے سے روک سکتے ہوں۔

اس پہلو میں یہ تنقیدی نقطہ غالباً اہم ہے کہ جسکے باعث چیئرمین گونزیلو کی گرفتاری ہوئی۔ جب میں نے چیئرمین کی گرفتاری کے اہم وجوہات کی تحقیق اس نیت سے کی کہ اُن نقائص وکمزوریوں کی نشاندہی کی جاسکے کہ جس کے باعث اس تحریک کو شدید نقصان پہنچا تو مجھے نہایت دلچسپ انکشافات کا ادراک ہوا کہ جسے بعض لوگ شائد احمقات سمجھیں مگر درحقیقت وہ اس قدر معمولی غفلت ہے کہ جس کے متعلق شائد ہی کوئی غور کرتا ہو۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ چیئرمین گونزیلو جب روپوش ہوئے تو اُن کی تلاش میں پیروسرکار نے اپنے خفیہ اداروں کے ساتھ امریکیوں کی بھی مدد طلب کی اور اُن کی تلاش میں اس نقطے کو اہم قرار دیا گیا کہ جدید دور میں چھپتے رہنے کے باوجود بھی کسی عوامی تحریک کی رہنمائی کیلئے مستقلاً رہائش کیلئے کسی فلیٹ کا سہارا لیا جاسکتا ہے، چونکہ فلیٹ میں رہائش کے بلا تکلفانہ رویے کو دیکھتے اپنی پہچان کو بدلتے باآسانی رہائش اختیار کی جاسکتی تھی اس لئے خفیہ اداروں نے پہلے پہل لیما شہر کے تمام فلیٹوں پہ اپنی توجہ مرکوز کی اور بعدازاں ان فلیٹوں کے تمام کوائف حاصل کرتے اُن میں رہائش پذیر لوگوں کے متعلق معلومات کو یکجا کیا گیا اور اس کا موازنہ فی فلیٹ سے نکلنے والے متوقع کوڑے وکچرے سے کیا گیا۔ اس پر آدھے سے زائد فلیٹوں پر توجہ اس لئے ترک کر دی گئی کہ اُن میں مقیم لوگوں، اُن کے پیدا کردہ کوڑے کے تناسب میں یکسانیت پائی گئی۔ مگر جمع کردہ کوائف کے تحت چند ایسے فلیٹ بھی ظاہر ہوئے کہ جن میں بظاہر رہائش پذیر افراد کی تعداد کم اور اُس فلیٹ سے پیدا کردہ کوڑا زائد تھا۔ ایسا ہی ایک فلیٹ جو مارٹزا گیریڈو لیکا (Martza Garrido Lecca) نامی رقاصہ کا تھا کہ جس نے اپنے اس فلیٹ کی رجسٹری کرتے وقت اسے محض اپنی رہائش گاہ بتایا تھا مگر چھان بین کے بعد یہ بات واضح تھی کہ اس فلیٹ سے نکلنے والا معمول کا کوڑا اپنے تناسب کے اعتبار سے فاضل تھا اور اسی ایک معمولی غلطی کے باعث یہ فلیٹ خفیہ اداروں کے شک کے دائرے میں آیا جس پر بعدازاں سخت نگرانی رکھی گئی اور پھر چھاپہ مارتے چیئرمین گونزیلو کے علاوہ 8 افراد کو گرفتار کیا گیا۔

اس تناظر میں ہم ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کا بھی قصہ بیان کر سکتے ہیں کہ جنہوں نے نہایت ہوشیاری سے گھر میں پیدا ہونے والے تمام کوڑے وکمرے کو گھر کے اندر ہی بذریعہ (trash-machine) ٹھکانے لگانے کا محفوظ انتظام کر رکھا تھا مگر وہ اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلاتے، اُنکے لعاب (Saliva) کے توسط اُنکے (DNA) کے نمونے دینے سے CIA کے شک کو یقین میں بدلنے کی غلطی کر گئے۔

دوبارہ اپنے موضوع بحث پہ جانے سے قبل میں یہ بتاتا چلوں کہ اپنی گفتگو کے آغاز میں چیئرمین گونزیلو کی تعریف میں جو کچھ میں نے لکھا جو یقیناً حقائق پہ مبنی تھا۔ اب شائد قصیدوں کے وہ مینار بعض قارئین کے سامنے خاک میں ڈھیر محسوس ہوتے ہوں کیونکہ چیئرمین گونزیلو جو ایک طرف کٹر ماؤسٹ نظریات کا پرچار کرتے انقلاب کی خاطر پُرتشدد کارروائیوں کو اپنے منطق سے درست ثابت کرتے رہے وہ گرفتاری کے عرصہ بعد اچانک صدارتی مشیر سے گفت وشنید کرنے پہ راضی بھی ہوئے اور یہی نہیں بلکہ 1993ء میں آپ اچانک ٹی وی کے سامنے آئے اپنے تمام پارٹی عہدیداروں کو ''امن'' قائم کرنے کی تاکید کرنے لگ جاتے ہیں، گو کہ تحریک میں حکمت عملی کے تحت مفاہمتی پالیسیوں کا اطلاق جرم نہیں مگر یوں، بناء کسی اہم وجہ یا اپنے سیاسی مقاصد کے برخلاف ایکدم سے مفاہمت کا عمل شروع کر دینے کی تاکید کر دینا بنیادی مقصد کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھا۔ ہم دیکھتے بھی ہیں کہ اس

کے زیر اثر شائننگ پات دو حصوں میں منقسم بھی ہوئی کہ جس میں ایک بڑی تعداد نے اس مفاہمت کی پالیسی کو چھٹکارا سمجھتے حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالتے سرینڈر بھی کیا اور بعض نے چیئرمین کو زندان میں قید ہوتے یوں ٹوٹتا دیکھ اُن کی صدارت کو چیلنج کرتے یہ موقف اختیار کیا کہ چونکہ چیئرمین دشمن کے قبضے میں ہے لہٰذا اُن کا کوئی بھی فیصلہ پارٹی موقف تصور نہیں کیا جا سکتا مختلف دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ تقریباً (6000) چھ ہزار گوریلوں نے مفاہمتی پالیسی کے تحت خود کو سرینڈر کیا جو یقینی طور پر ایک تباہ کن نقصان کے سوا کچھ نہیں۔

شخصیت پرستی کے باعث ایسی عوامی تحریک کو یوں زوال پذیر ہوتے دیکھ ہمیں یہ چاہیے کہ ہم اپنے اذہان کو کسی بھی طرح اس زہر سے آلودہ نہ ہونے دیں گو کہ شخصیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر شخصیت چونکہ مختلف عناصر کا مجموعہ ہوتی ہے اور قومی قائدین کی شخصیت میں اُنکی قومی مفاد کے تحت سرپرستی کرنے کی صلاحیت ہی وہ خوبی ہوتی ہے کہ جسکے باعث عوام اُن سے محبت کرتی ہے لہٰذا اسی خوبی کے برقرار رہنے کی ہی صورت میں دیگر سطحی خوبیوں کی اپنائیت ہونی چاہیے تاکہ سطحی خوبیوں کو اس اہم خوبی سے مبادلہ کرتے کسی قائد کی غلط و تحریک دشمن فیصلوں کو اپناتے مخلص رہنے کے باوجود بھی قومی مجرم بننا چاہیے اور ایسے حادثات کہ جنکے ہولناک نتائج دیکھتے ہم اُنہیں سانحہ یا انگریزی میں (Treacherous Tragedies) کہیں، عمومی طور پر تحریکوں میں رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جسکی واضح مثال خود بلوچ قوم کی میر غوث بخش بزنجو کی محض شخصیت سے انسیت ہونے کے باعث رونما ہوئی، بھلا ہم کیسے درست و برحق ثابت کر سکتے ہیں کہ بلوچ معاشرے کا وہ سیاسی رہنما جو آزادی کے وقت مادر وطن کے پاکستان سے الحاق کئے جانے پر سخت تنقید کرتا ہوا بلوچ قوم کو پاکستانیوں سے یکسر مختلف ہونے کی دلیل دیتا رہا اور پھر پاکستان کے بلوچستان پر قبضے کے بعد خود جا کر ایسی جماعت میں شامل ہو کہ جس نے خود پاکستان کی تحریک چلائی!

شخصیت پرستی کے باعث یہ کیسا سیاسی المیہ تھا کہ مکران میں سیاست کرنے والے سیاسی حلقے جو ایکطرف خود کو سیاسی طور پر باشعور کہتے تو دوسری طرف خود پر قابض حکومت کے طے کردہ آئین کہ جسکی توسط ایک مقبوضہ وطن کو ایک صوبہ تسلیم کئے جانے کی قانونی راہ ہموار کی گئی، اُنہی قائدین کو بابائے بلوچستان کہا گیا!

یہ شخصیت پرستی کا شکار ہوتے ساحلِ مکران میں بسنے والے لاکھوں سیاسی کارکنان کی سیاسی بصیرت و دانش کا کیسا تمثلی جنازہ تھا کہ اُن کی آنکھوں کے سامنے اور ماڑہ جیسی پاک سرزمین قابض پاکستانی ریاست کا ''جناح نیول بیس'' نامی قبضہ گیریت کا ایسا قلعہ تعمیر ہوا جو جنوبی ایشیاء کی سب سے بڑی نیول بیس میں سے ایک تھا اور اہل مکران قبضہ گیریت کے ایسے واضح نشان کو نظر انداز کرتا اپنے قائد کی سیاسی پالیسیوں پہ ایک سوال بھی نہ کر پایا، اس مد میں اگر اُن کا احتجاج بھی تھا تو وہ کچھ اس نوعیت کا کہ قبضہ گیریت کو زیادہ سہل کرنے کی خاطر تعمیر کئے گئے اس قلعے میں بحیثیت دربان انہیں بھی نوکریاں دیتے کیوں اس جرم میں ملوث نہیں کیا جا رہا!

درحقیقت اُن وقتوں اہلِ مکران کے بیشتر سیاسی کارکنان کو شخصیت پرستی کی توسط غیر انقلابی رجحانات کا شکار کرتے چند اشخاص کا 'سیاسی غلام' بنا دیا گیا تھا، جو عام عوام کو بہتری کی اُمید دیتے اپنے مکروہ عزائم کو اُن ہی کا فیصلہ کہتے یہ بات ''غلط مشہور'' کرتے گئے کہ اہلِ مکران اپنی سیاسی بصیرت کے باعث بلوچستان کے دیگر علاقوں سے قدرے بہتر ہیں، اُن علاقوں سے بھی بہتر کہ جہاں کا ایک عام چرواہا تک سیاسی بلدگی کی اُس چوٹی (مسلح جدوجہد) کو سر کر چکا تھا کہ جسے سر کرنے کی عظمت حاصل کرنا ہر انسان کے بس میں نہیں، دراصل اُن وقتوں اہل مکران سیاسی پستگی و جہالت میں گھرا وہ علاقہ تھا کہ جہاں فقط چند اشخاص کے ذریعے ہی قبضہ گیریت کے ہر وطیرے کو نہایت فعال و منظّم انداز میں انجام دینا سہل تھا اور ایک طرح سے یہ سب اُن علاقوں میں موجود سیاسی کارکنان کا تمسخر اُڑانے کے مترادف تھا جو شخصیت پرستی کے سحر میں مبتلا ہوئے خود اپنی غلامی کو مزید مستحکم بنانے کے جرم میں ملوث ہونے کے باوجود خود کو سیاسی طور سے باشعور سمجھتے اور ایسی طمانیت کے تاثر دیئے جانے کا مقصد دراصل ''خود تنقیدی'' جیسے انقلابی مشق سے پرہیز کرنے کی جانب راغب کرنا تھا۔

انسان کی کُل سیاسی تاریخ کو دیکھتے میرے نزدیک یہ بات فطری ہے کہ وہ سیاسی ورکر جو اپنے قائد کی مرتب کردہ پالیسیوں پہ بلاتنقید یا اُن کے ممکنہ نتائج کو بنا سمجھے عمل پیرا ہو تو وہ خود کو اس بات کا مستحق قرار دیتا ہے کہ اُس کی تمام تر مخلصی و قربانیوں کے باوجود بھی نہ صرف تاریخ اُس کا تمسخر اڑائے بلکہ اُسے گمراہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اُس کی اس بات سے بھی تضحیک کی جائے کہ وہ اپنی حماقتوں کے باوجود منزل کے قریب ہے۔

پختون بچی پر حملہ، ایجنسیوں کی کارستانی!

علی شیر

پاکستان اپنی ریاستی وجود کو دنیا کے نقشے پر برقرار رکھنے اور گرتی ساکھ کو سہارا دینے، انتہائی چالاکی و چابک دستی سے چالبازی و واویلا کرنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اعلیٰ سطح پر منظّم منصوبہ بندی کے تحت مختلف نان ایشوز میں جان ڈال کر ڈرامائی انداز میں انہیں عالمی ایشوز کا درجہ دلوا کر شاطرانہ طرزِ عمل اختیار کرنے اور ہمدردی جتانے کی بچی کچی کسر بھی پوری کر دی، جسکے پس پردہ بنیادی طور پر دو مقاصد کارفرما رہے ہیں۔

اول: انکا عالمِ اقوام کے سامنے دہشت گردی و انتہا پسندی اور انکی اعانت سے پاک خود کو پاکیزہ و پاک دامن ریاست باور کرانا مقصود ہے۔

دوئم: خطہ و عالمی سطح پر بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی بظاہر مخالفت اور اس کے تحت اپنے آپ کو نیٹو و عالمی برادری کا ایک اہم اتحادی ثابت کر کے دنیا سے معاشی و عسکری امداد کا حصول ہے۔

1979ء سے تا حال امریکہ کے ساتھ افغانستان میں کمیونزم کا شیرازا بکھیر نے اور وار اِن ٹیرر میں معاون کا ماسک چڑھا کر عالمی دہشت گردی کے اس آماجگاہ نے اس پورے عرصے میں دھوکہ دہی و منافقت سے کام لے کر اپنا حقیقی و مکروہ چہرہ دنیا سے اوجھل رکھنے کی سعی لا حاصل کی۔ مگر اس کے متضاد اور دہری معیار کردار پر اس وقت لرزہ طاری ہوئی اور قیامت آن پڑی جب سی آئی اے کو ایبٹ آباد میں پاکستانی فوج کے کیپ تلے القاعدہ سربراہ بن لادن کا سراغ ملا اور ایک حساس نوعیت کے سرجیکل سٹرائیک میں انکا کام تمام کر دیا گیا، تب سے یہ بدنام ریاست دنیا اور خود امریکہ کے لیے ناقابلِ قبول ٹھہرتا گیا، مگر اس خطے میں امریکہ کی موجودگی اور قائم اثر رسوخ نے غالباً انہیں مکمل طور پر اپنا ہاتھ کھینچنے سے روکے رکھا۔ ساتھ ہی سی آئی اے کے پاکستانی ایجنٹ ڈاکٹر شکیل آفریدی کو بھی 33 سال قید کی سزا سنا کر سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا، جو بن لادن کی سراغ رسانی میں بے پناہ کردار کا حامل رہا ہے۔ بعد ازاں اس امر پر امریکہ کی جانب سے شدید برہمی کا اظہار کیا گیا اور پاکستان کی معاشی و عسکری امداد میں خاطر خواہ کٹوتی کی گئی۔ جیل سے امریکی میڈیا فاکس نیوز کو اپنے دیے گئے حالیہ خفیہ انٹرویو میں ڈاکٹر شکیل آفریدی نے پاکستان اور اسکے خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کا طالبان و القاعدہ کو عسکری و معاشی امداد کی فراہمی اور حقّانی نیٹورک سے براہ راست تعلق سمیت خطے میں افغانستان و بھارت کو عدم استحکام کا شکار بنانے و پر امن علاقائی فضاء کو تباہ کرنے و دیگر حساس نوعیت کے بہت سارے رازوں پر سے پردے اٹھائے تھے۔ مگر پاکستان بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دنیا کو بلیک میل کرنے اور بیوقوف بنانے کی راہ پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی نیٹو سپلائی بندش اور دفاع پاکستان کونسل (ملاّ ملٹری اتحاد) کی مدد سے احتجاج کے نام پر لوگوں کو اکسانے اور امریکہ مخالف جذبات بھڑکانے کی آڑ میں دنیا کو بلیک میل کر کے مالی و عسکری سپورٹ حاصل کرتا ہے تو کبھی ریمنڈ ڈیوس جیسے غیر ملکی ملزمان کو بھاری رقوم ادائیگی کے عوض رہا کر دیتا ہے۔ گھناؤنے سازشوں کے تحت روایتی حریف ہمسایہ ملک بھارت کے خلاف اپنے بغل بچہ مذہبی انتہا پسند تنظیموں کو استعمال کر کے ممبئی جیسے حملوں کے زریعے انہیں خبردار رہنے کی خاموش دھمکی دیتا ہے تو کبھی ایران سے بلوچوں کی لین دین کی سودے بازی کر کے لاء اینڈ آرڈر کے نام پر انکی نسل کُشی کرتا ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ پاکستان نہ صرف اس خطے بلکہ عالمی امن کا قطعاً خواہاں نہیں۔ جس طرح افغانستان صورت حال پر چند برس قبل جرمنی میں منعقد کیے گئے بون کانفرنس کا بائیکاٹ کیا گیا اور افغان مستقبل کے حوالے سے ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ جب قطر میں امریکہ طالبان مابین مزاکرات کا آغاز ہوا تو پاکستان کُود پڑا اور تعاون کرتا رہا، حالانکہ اس عمل میں افغانستان کی کوئی نمائندگی شامل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ برس 13 ستمبر کو قابل میں امریکی سفارتخانے پر حملہ اور اس کے سات دن بعد 20 ستمبر کو افغانستان میں ہائی کونسل برائے امن کے چیئرمین برہان الدین ربّانی کو بھی اسی لیئے قتل کروا دیا گیا کہ وہ امن اور مذاکرات کے خواہاں تھے۔ کیونکہ پاکستان اس خطے میں پر امن اور مستحکم افغانستان کو ہضم

نہیں کرسکتا۔ افغانستان اور امریکہ نے پاکستان کو ان کاروائیوں میں برائے راست ملوث قرار دیا۔اسی طرح جب کرزئی اور امریکہ کے مابین تعلقات کشیدہ ہوئے تو صدر حامد کرزئی پاکستان سے ایک بار پھر دوطرفہ امن کمیشن کو فعال بنا کر امریکہ کے بغیر امن کا آغاز کرنے پر زور دے رہے تھے مگر پاکستان نے امریکہ سے نرم گوشہ اور ہمدردی کے حصول کے خاطر عالمی سامراج کے بغیر کوئی کام نہ کرنے کا خوبصورت بہانہ تراش دیا۔آج ایک عام افغانی اپنے ملک کی تباہی کے لیے روس اور امریکہ کو اس قدر زمہ دار نہیں ٹھہراتے جتنا کہ آئی ایس آئی اور پاکستانی پالیسی سازوں کو ٹھہراتے ہیں۔ یوہان برزنیف اور جارج بُش واوبامہ کو اتنی بددعائیں نہیں دیتے جتنی کہ پاکستانی جرنیلز کو دی جاتی ہے۔ پاکستان افغانستان میں افغانیوں کی قومی مفاد کے برخلاف افغانستان میں طالبان سے پسِ پردہ دہشت گردی کروارہا ہے۔امریکہ اپنی ناکامیوں کا زمہ دار بھی پاکستان کو ٹھہراتے ہیں کہ اُسامہ کی برآمدگی اور طالبان رہنماؤں کی پاکستان میں موجودگی ثبوت ہیں۔ امریکہ، فرانس، جرمنی، روس، بھارت و دیگر پاکستان کو دہشت گردوں کا گڑھ سمجھتے ہیں جبکہ امریکہ کے زیرِ سایہ موجودہ افغان حکومت بھی طالبان کو سپورٹ کرنے کی وجہ سے پاکستان سے ناراض ہے۔ پاکستان کی منافقت دیکھیے جب پاکستان میں موجود طالبان سے مذاکرات کے حوالے سے کہا جاتا ہے تو پاکستان کہتا ہے طالبان اس کے زیرِ اثر نہیں ،مگر بیک وقت پاکستان شمالی وزیرستان میں طالبان کے خلاف کاروائی سے بھی گُریزاں ہے جبکہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ پاکستان اور طالبان ایک ہیں۔

مزید برآں معمر اور بیمار افغان کمانڈر مولوی جلال الدین حقّانی کے بیٹے سراج الدین حقّانی کے زیرِنگرانی طالبان کے بارے شمالی وزیرستان میں موجود حقّانی کے محفوظ ٹھکانوں کو تباہ کرکے انہیں نیست و نابود کرنے کی امریکی بار ہا دباؤ کے باوجود پاکستان انکے خلاف کاروائی سے یکسر گریزاں ہے۔ پاکستان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ مستقبل میں اگر پاکستان نے ان ناپسندیدہ کرداروں یعنی حقانی وغیرہ سے خود کو الگ نہیں کیا تو امریکہ کے ساتھ پاکستان کی اشترا کی حکمتِ عملی کمزور ہوسکتی ہے۔دوسری طرف امریکہ نے پاکستان اور افغانستان میں عسکری مہم کو کم نہیں کیا ہے۔ اسکے برعکس پاکستان کے قبائلی علاقوں میں حقانی نیٹورک کی طاقت کو کم کرنے کے لیئے ڈرون حملوں کی شدت میں اضافہ ہوا ہے اور امریکہ کے زیرِ نگرانی نیٹو افواج خصوصاً رات کے اوقات میں ڈرون حملوں کے زریعے طالبان کا جارحانہ تعاقب کررہی ہیں ۔ بالخصوص شمالی وزیرستان کے بڑے شہر میرانشاہ کے گاؤں ڈینڈے درپاخیل کو ڈرون حملوں کا مسلسل نشانہ بناتے رہے ہیں جہاں حقانی خاندان سالوں سے آباد تھا۔ پاکستانی صحافی سلیم صافی افغانستان اور پاکستان کو قریب لانے اور طالبان سے بات کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، انکو پتہ ہے کہ طالبان ہی پاکستان کا دوسرا نام ہے۔محمود خان اچکزئی بھی کہتے ہیں کہ آئی ایس آئی اگر چاہے تو ایک ماہ کے اندر افغانستان میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ زکر ہے کہ پاکستان ڈالر وصولی کے عوض انگنت پختونوں کو اپنے جیلوں میں پلہ بڑھا کر انہیں طالبان ظاہر کرکے امریکہ حوالگی کے مذموم کھیل میں اپنے اشرفیائی مفادات کو ہمیشہ تحفظ دیتا چلا آیا ہے۔صرف مشرف کے دورِاقتدار میں 600 سے زائد پختونوں کو جن میں اکثر و بیشتر عام لوگ ہی تھے، طالبان کا لیبل چڑھا کر انہیں امریکہ کے حوالے کیا گیا۔شہرت یافتہ عافیہ صدیقی بھی انکے مفادات کے بھینٹ چڑھ گئی جنہیں 2003 میں پاکستانی خفیہ اداروں نے کراچی سے اغوا کرکے امریکی اداروں کے حوالے کیا تھا، مگر اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں افغانستان سے گرفتار کروانے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ سلطان محمود غزنوی کے مزار کے قریب انکی گرفتاری ڈالی گئی، پھر امریکی عدالت نے انہیں 86 برس قید کی سزا سنادی ہے۔

دوسری جانب بلوچوں کی طرح فاٹا اور قبائلی علاقہ جات میں پختون قوم کو آپس میں لڑانے اور مروانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔قبائلی لوگوں کی نجی لشکریں تیار کرکے انہیں جنگجوؤں اور مسلّح گروہوں سے دست و گریبان کرنے اور خونریزی کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس سے ریاستی مفادات کو تقویت دی جارہی ہے۔اس خونریز نسل کشی میں پاکستانی فوج واسٹابلشمنٹ اور اشرفیاء طبقہ جتنا زمہ دار ہے اس سے کہیں بڑھ کر پختون سیاسی پارٹیاں بالخصوص اے این پی اور جمعیت علمائے اسلام جیسی ریاستی ہم خیال اور شراکتِ اقتدار جماعتوں کا بھی ہاتھ ہے۔جس طرح مالاکنڈ ڈویژن کے تحصیل کبل اور سوات کے علاقوں میں قبائلی لشکریں تیار کی گئی ہیں، جو سرکار کی سرپرستی میں پورے علاقے میں سینہ تھان

کے گھومتے ہیں، رات کے اوقات علاقے کی آبادی میں مسلح گلیوں میں پہرہ دیتے ہیں، جونجی لشکروں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ لشکران بااثر لوگوں یا بالفاظ دیگر ریاستی دست وبازوؤں کے زیر کنٹرول رہتے ہیں جنہیں سرکار کی جانب سے فری ہینڈ دیا گیا ہوتا ہے، اور اسلحہ راہداری وخصوصی اجازت ناموں کے زریعے علاقے میں خدا کے نائب کا رُوپ دھارے ہوتے ہیں۔ جس طرح مقبوضہ بلوچستان میں شفیق مینگل، رئیسانی وزہری برادران، جمیل بزنجو وامام بیل اینڈ کمپنی، چمالانگ مری فورس اور بگٹی امن لشکر (سرکاری لشکریں) سامراج کے چھتری تلے کام کرتے ہیں۔ انکی زندگی کی گھڑیاں اس وقت تک شاید چلتی رہیں جب تک یہ ریاست کی جی حضوری کرتے رہیں گے لیکن جب نچوڑی گئی لیموں کی طرح انکی اہمیت صفر ہو کے رہ جائے تو سامراج انکے لیے کوئی نرم گوشہ اختیار نہیں کرتا اور یہ پاکستان سامراج کا عرصہ دراز سے وطیرہ چلا آرہا ہے کہ پاکستانی خفیہ ایجنسیاں اور فوج ہر دور میں خود ساختہ رہنما اور کارندے پیدا کرتے ہیں، پہلے انہیں پروان چڑھاتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد انہیں مار دیا جاتا ہے، جیسا نیک محمد اور لال مسجد کے غازی عبدالرشید کے ساتھ روا رکھا گیا۔

قطع نظر اِن سب کے پاکستان ریاست اس وقت داخلی اور خارجی طور پر انتہائی دباؤ کا شکار ہے اور ریاستی ساکھ بُری طرح بدنامی سے دوچار ہے۔ مہذب عالمی دنیا نہ صرف پاکستانی سرکار بلکہ پاکستانی عوام سے بھی حد درجہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام ہی کسی ریاست یا مملکت کا اصل سرمایہ ہوتا ہے اور عوام ہی کسی تبدیلی یا تذلیلی کا محور سمجھا جاتا ہے، جہاں بے شمار طبقات وتنظیمیں وجود رکھتی ہیں۔ مثلاً ویتنام میں امریکی قبضہ گیریت کے دوران محکوم قوم کو گاجر مُولی کی طرح کاٹا گیا، لیکن امریکی عوام کے بعض حلقوں نے اس پر شدید احتجاج ریکارڈ کرایا اور عراق جنگ کے حوالے سے بھی یہی صورت حال دیکھنے کو ملا۔ اسی طرح الجزائر میں فرانسیسی جارحیت کے دوران الجزائری قوم کی قتل وغارت کیخلاف فرانسیسی دانشور اور عوام سراپا احتجاج ہوگئے اور حق کا ساتھ دینے لگے۔ مگر پاکستانی نام نہاد دانشوروں اور عوامی حلقوں کی بے حسی نے انہیں عالمی دنیا میں بُری طرح بدنامی کے جال میں جکڑ دیا ہے۔

آج جس طرح بلوچستان میں شب خون مارا جارہا ہے، چار دہائیوں پہلے بالکل اسی طرح بنگالی قوم کے ساتھ روا رکھا گیا اور اس وقت بھی پاکستانی دنیا میں جہاں کہیں بھی بستے تھے انہیں انتہائی حقارت ومنافرت بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ پاکستانی طلبا وطالبات جو امریکہ ویورپ کے بڑے بڑے اداروں میں زیرِ تعلیم تھے، تنقید اور نفرت کے نشانے پر ہوا کرتے تھے۔ مثلاً 1971ء کو بنگلا دیش میں پاکستانی جارحیت کے دوران بے نظیر آکسفورڈ میں زیرِ تعلیم تھیں۔ ان سے بنگالی عورتوں کی پاکستانی فوجیوں کے ہاتھوں عصمت دری اور بنگالی عوام کی نسل کشی کے حوالے سے مختلف طبقہ فکر بالخصوص طلبہ کی جانب سے شدید برہمی اور سوالات کی بوچاڑ کی گئی تو بے نظیر ان دنوں حقائق سے منہ موڑ کر، ان باتوں کو رد کرتے ہوئے انہیں پاکستان کے خلاف بھارت اور عالمی سازش قرار دیا۔ جس طرح آج کے پاکستانی سیاست دان، دانشور، سِول سوسائٹی، انسانی حقوق کے دعویدار بشمول پاکستانی عوام بلوچ نسل کشی کو را، موساد اور سی آئی اے کی سازش اور کارستانی قرار دے کر پاکستانی سامراج اور اسکے اداروں کو بری الذمہ قرار دینے کی سعی لاحاصل میں لگے پڑے ہیں، مگر انہیں کچھ بھی ہاتھ آنے والا نہیں۔ برعکس اسکے یہ خود ہی پاکستانی کی خستہ حال بنیادوں کو کریدنے کے مئوجب بن رہے ہیں۔ اسی لیئے پاکستان عالمی دنیا سے اپنی کھوئی ہوئی اعتماد اور عوامی ہمدردی کی بحالی کے لیے اب کی بار پہلے سے کہیں بڑھ کر موثر انداز میں مختلف چال چل رہے ہیں، جنہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

رواں سال اکتوبر کے اوائل میں سوات کے شہر مینگورہ میں قائم درجنوں چیک پوسٹوں اور کئی سو اہلکاروں کی مذکورہ علاقے میں موجودگی کے باوجود ایک کم عمر پختون طالبہ کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ خوشحال سکول سوات میں زیرِ تعلیم چودہ سالہ ملالہ یوسف زئی المعروف گُل مکئی سمیت سکول وین میں سوار انکے دیگر دو طالبات ساتھی فائرنگ کے نتیجے میں زخمی ہوگئیں جنہیں فوری طور پر COMBINED MILITARY HOSPITAL (CMH) شفٹ کردیا گیا۔ ملالہ کو CMH پشاور سے راولپنڈی اور بعد ازاں خصوصی کارگو ایئر ایمبولینس کے زریعے لندن کے شہر برمنگھم میں کوئن الزبتھ ہسپتال منتقل کردیا گیا جہاں وہ تاحال زیرِ علاج ہے۔

ایک نہتی اور چھوٹی بچی پر حملہ دلخراش ضرور ہے اور یہ کسی بھی انسان کے لیئے قابل

افسوس بھی۔لیکن پاکستان میں کسی بھی گروہ، ادارے یا خودساختہ ٹولے کی جانب سے اپنے مفادات کے دفاع کے لیے کسی انسان کی جان مال عزت آبرو کی کوئی اہمیت نہیں۔جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا کہ سینکڑوں نہتے ومعصوم پختون ریاستی واشرفیائی مفادات کے بھینٹ چڑھائے گئے، اب بھلا ایک چھوٹی بچی کی جان کی کیا حیثیت جو پاکستانی عوام کے لیے عالمی دنیا سے محبت وہمدردی کے حصول کا زریعہ بنے!! اور پاکستانی فوج وانکی خفیہ ایجنسیز اپنے مذموم منصوبے میں ایک حدتک کامیاب بھی ہوئے، کیونکہ اس واقعے کے بعد پہلے ہی سے نکھارشدہ کردار کے واہندملالہ یوسفزئی کو نہ صرف علاقائی وملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی صحافتی حلقوں ،انسان دوست اداروں اور سِول سوسائٹی میں جہاں توقعات سے بڑھ کر پزیرائی ملی وہیں اقوام متحدہ کے توجہ کا مرکز بھی بنا رہا اور حتیٰ کہ دس نومبر کو یومِ ملالہ سے منسوب کیا گیا۔

یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ پاکستانی اشرفیہ کلاس کے ایک صحافی عبدالستار کاکڑ نے 2009-2008 میں فوج کی ایما پر ملالہ کو ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت سوات سے دریافت کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ چونکہ ملالہ کے والد ضیاء الدین یوسفزئی سوات قومی امن جرگہ کے ترجمان اور پاکستانی فوج و خفیہ اداروں کے اہم کارندے ہیں، اپنی بچی کو اس مرحلے تک پہنچانے میں ہر اوّل دستے کا کام کیا۔جس میں 2009 کو برطانوی نشریاتی ادارے کو لکھی گئی ڈائری بھی غورطلب ہے۔اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ 2009 کو ملالہ صرف دس گیارہ سال کی عمر میں سوات کے خوشحال سکول میں زیرِتعلیم تھی، بھلا وہ کیسے اتنی بالغ نظری کا مظاہرہ کرتی تھی۔اگر واقعتاً یہ انہی کی کمال صلاحیت کا نتیجہ اور غیرمعمولی کردار کی ایک جھلک تھی تو عالمی امن ایوارڈ کی 93 نامزدگان میں انکی نامزدگی کے بعد کیوں انہیں تحفظ فراہم نہیں کی گئی؟ اور کیا پاکستانی نیوٹریشن پر پھلنے پھولنے والے خود ساختہ طالبان 2009 سے 2012 تک کے تین سالوں میں اتنے کمزور نکلے کہ وہ نہتی ملالہ کو کہیں بھی ہٹ نہ کرسکے جو مہران بیس، جی ایچ کیو و دیگر حساس مقامات پر حملوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ساتھ ہی اگر غور کیا جائے تو 2009 میں بی بی سی اردو سروس کو لکھی گئی ڈائری کے بعد تب سے اب تک ملالہ کی کوئی خاص کردار سامنے نہیں آئی، تو بھلا کیوں اب انہیں حملے کی ضرورت پیش آئی؟

''ہمارے ناقص خیال میں یہ سارا ڈرامہ تھا اور دنیا سے ہمدردی حاصل کرنے کا ذریعہ!''

دوسری جانب اس میں سیاسی چپقلش بھی شامل تھی اور عمران خان کی کھیلی گئی وکٹ کو نو بال گردانے اور انہیں نیچا دکھانے و سیاسی طور پر کمزور کرنے کی ایک کوشش بھی نمایاں تھی جس سے امریکہ وقبائلی علاقہ جات کے عوام سے پوائنٹ اسکورنگ کا کارڈ کھیلا گیا جو پاکستانی سیاست کے ورثہ میں شامل ہے۔یاد رہے کہ اس واقع کے ایک روز قبل امریکی ڈرون حملوں کے خلاف اور طالبان کے دلوں میں جگہ پانے کے لیے عمران کی جانب سے اپنی یہودی بیوی کے چندرشتہ داروں اور کچھ غیرملکی عیسائیوں کے ساتھ پی ٹی آئی کے زیراہتمام قبائلی علاقوں میں ایک ریلی نکالی گئی تھی، اورٹانک جلسے میں قبائلی سادہ لوح عوام سے بظاہر ہمدردی جتانے کی آڑ میں اپنے ووٹ بینک کو وسیع ومستحکم بنانے کی خاطر امریکہ اور ڈرون حملوں کی مخالفت میں زہرافشانی کی گئی اور مقتدرہ پر شدید تنقید کرتے ہوئے خود کو پاکستان کا اگلا مسیحا باور کرانے میں خوشامدی کلمات کہتے رہے، جو محض ہوا میں قلعے بنانے کے مترادف تھے۔

چونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ طالبان اور پاکستان ایک ہی ہیں اور پاکستان نے ضیاء دور آمریت میں افغانستان پر سویت یونین کے یلغار کے دنوں امریکہ کے آشیرباد سے انہیں جنم دیا تھا اور یوں یہ امریکی سرپرستی میں پاکستانی فوج وآئی ایس آئی کے ناجائز بچے ہیں، اور تب سے پاکستان ، امریکہ اور طالبان کے بیچ پُل (BRIDGE) کا کردار ادا کررہا ہے۔اس دوران طالبان کے نوزائیدہ فصل امریکی ڈالر کی FERTILIZERS سے خوب پھلے پھولے اور جڑ پکڑتے گئے۔یہی وجہ ہے کہ وہ آج اتنے تندرست وتوانا ہوگئے ہیں کہ اپنے باپ امریکہ کو بھی آنکھیں دکھانے سے نہیں کتراتے۔انکی پوری کی پوری ہمدردی پاکستان کے ساتھ ہے۔جس طرح ماضی بعید اور ماضی قریب میں یہ پاکستان کی تحفظ و سلامتی میں کمرکس کر کبھی بھارت وامریکہ تو کبھی بلوچوں کو آنکھیں دکھاتے رہے ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ پاکستان کے دست و بازو ہیں تو آخر کیوں یہ جی ایچ کیو اور مہران بیس جیسے عسکری اداروں پر حملوں کا ارتکاب کرتے

چلے آئے ہیں۔ اس بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ جس طرح ہمارے ہاں پارلیمانی پارٹیاں بی این پی وائین پی، شفیق واختر مینگل اور پی پی پی و مسلم لیگی دھڑے مجموعی طور پر پاکستانی خدمت گزاری کے ایک ہی نظریہ پر کاربند ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں اور اپنے منصب و کارکردگی یا اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کی خاطر باہمی چپقلش اور خود ساختہ اداروں میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ اور بلا شبہ مداخلت کا یہ رویہ پاکستانی اسٹیٹ کی ایک فطری عمل ہے بالکل اسی طرح یہ بات طالبان پر بھی صادر آتی ہے اور آج اگر ہم طالبان کو پاکستان کے ایک ادارے کا نام دیں تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ یہ بھی اسی کھیل کا ایک حصّہ ہیں۔ اور ان میں باقاعدہ ایک PRESSURE GROUP ہے جو اپنا اثر رسوخ برقرار رکھنے اور فوجی و انتظامی اداروں میں اپنی اہمیت منوانے کی خاطر اس قسم کے کام وقتاً فوقتاً سرانجام دیتے رہتے ہیں اور ان فوجی وانتظامی اداروں میں ان کے کارندے و ہمدرد اچھی خاصی تعداد میں گھسے ہوئے ہیں، جو ایسی مداخلت میں برائے راست کُمک فراہم کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں جی ایچ کیو، مہران بیس اس کی واضح مثالیں ہیں۔ جبکہ پولیس، لوکل فورسز اور مختلف قبائلی خود ساختہ لشکروں پر حملے اور باہمی خونریزی پنجابی اسٹابلشمنٹ کی ازلی سازش ہے جو قوم کی مختلف طبقات کو آپس میں دست وگریبان کرانے اور انہیں آپس میں لڑانے اور کمزور کرانے کے عزائم پر کاربند ہیں اور وہ اس ہنر میں کافی شناور ہو چکے ہیں۔

اسی طرح پاکستانی سِول اداروں میں آئی ایس آئی اور فوج کا برائے راست سکّہ چلتا ہے۔ ویسے تمام ادارے پاکستانی فوج کے بغیر دَم نہیں مار سکتے اور سب کے سب اس کے دُم چلے ہیں، مگر دفاع اور خارجہ کی وزارتیں بلا واسطہ انکی کنٹرول میں ہوتی ہیں جنکے لیے ناموں اور افراد کی تقرری خود فوج ہی کرتی ہے۔ فوج اپنی چاکری کرنے والی جماعتیں تخلیق کرنے اور اپنی مدار میں گردش کرنے والے دمدار سیاستدان تراشنے کی ہمہ وقت کوشش کرتی ہے اور ان جیسے حاکموں کی سیاسی آرزوؤں میں رنگ بھرتے رہتے ہیں اور پھر سِول وملٹری ادارے مل کر مشترکہ طور اپنے سیاسی عزائم کے بُت تراشتے ہیں۔

اور تو اور پاکستان میں نام نہاد جمہوریت کا مرشد زولفقار علی بھٹو اقتدار سنبھالتے ہی ایجنسیوں کی آشیر باد لینے انکے پاؤں پڑے، پھر انہوں نے اپنی دورِ حکومت میں بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں ایجنسیوں کو خوب استعمال کیا۔ یہی نہیں مئی 1975ء میں آئی ایس آئی کی پہلے سے جاری سیاسی کردار کو باضابطہ بنانے اور تحفظ دینے کیلئے وزیراعظم بھٹو نے آئی ایس آئی کے اندر ایک سیاسی سیل قائم کر دیا، جس کا نوٹیفیکیشن بھی جاری کر دیا گیا۔ پندرہ سال پہلے 16 JUNE 1997 کو اس وقت کے اٹارنی جنرل نے باضابطہ طور پر سپریم کورٹ آف پاکستان کو آگاہ کیا تھا کہ جی ہاں آئی ایس آئی میں ایک سیاسی سیل موجود ہے۔ 30 JUNE 1999 کو جسٹس سعید الزمان صدیقی کے نام لکھے گئے خط میں ائیر مارشل (ر) اصغر خان نے کہا تھا کہ آئی ایس آئی میں ایک سیاسی سیل کام کر رہا ہے اور چیف ایگزیکٹو (وزیراعظم) اس سیل کو فنڈز فراہم کر کے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ سابق آئی ایس آئی چیف جنرل اسد درّانی بھی اپنے بیان حلفی میں اس سیل کی تصدیق کر چکے ہیں اور آج پی پی پی کے تیسرے دورِ حکومت میں بھی یہ کام بڑی شدومد کے ساتھ سرانجام دیا جارہا ہے۔

حرفِ آخر: یہ پہلی دفعہ نہیں کہ ایک چھوٹی بچی کو ریاستی مفادات کے بھینٹ چڑھا دیا گیا بلکہ اس سوچ کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یاسمین اور ازگل بلوچ جیسی کئی معصوم بچیاں تک انکے شر سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ لیکن اب اس ڈرامے کا پول کھل چکا ہے، تمام سازشوں کے پردے فاش ہو چکے ہیں۔ ہماری اس موقف کہ جس میں ملالہ پر حملے کو برائے راست پاکستانی فوج وخفیہ ایجنسیوں کی کارستانی قرار دی گئی ہے، کو اس امر سے تقویت ملتی ہے کہ اس حملے پر فوری شدید ردِعمل کے بعد فوج کی جانب سے کور کمانڈر اجلاس بلایا گیا جس میں صدر پاکستان بھی شریک تھے اور فوج نے اس واقعے پر سِول حکومت کو اپنے اوقات میں رہنے کی سختی سے ہدایت کی اور صدر زرداری، ڈپٹی اسپیکر قومی اسمبلی نے اس فیصلے کی نہ صرف تائید کی بلکہ عوامی سطح پر یہ کہہ کر اس معاملے سے روگردانی کی کہ ''ایسے کئی ملالہ تو روز نشانے پر ہوتے ہیں، لہٰذا ایک ملالہ کے لیے کون صدمے میں ڈوبے!!!

سیکولرزام پس منظر میں

حمل بلوچ (کولواہ)

بلوچ معاشرے میں ان دنوں سیکولرازم کی اصطلاح کے ساتھ بہت ہی ناروا سلوک ہورہا ہے۔نام نہاد ملاؤں و عالموں کا ذکر ہی کیا اچھے خاصے پڑھے لکھے سیاسی لیڈرز وصحافی حضرات بھی لوگوں کو سیکولرازم سے بدگمان کرنے اور اپنی سامراجی و استحصالی پالیسیوں کو دوام بخشنے کی خاطر اور بلوچ عوام کو تحریک آزادی سے بیگانہ کرنے کے لئے اسکے معنی ومفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور یہ تاثر دینا چاہتے ہیں گویا سیکولرازم کینسر یا اچھوت کی بیماری ہے جس سے ہر شخص کو بچنا چاہیے۔ان کے خیال میں سیکولرازم ایک عفریتی نظام ہے جس سے بے دینی ،دہریت اور بداخلاقی پھیلتی ہے اور فتنہ وفساد کے دروازے کھلتے ہیں لہٰذا سیکولر خیالات کا سدباب ضروری ہے ورنہ اسلام اور بلوچ معاشرہ دونوں خطرے میں پڑ جائینگے۔

آیئے اس جھوٹ کا جائزہ تاریخی سچائیوں کی روشنی میں لیں۔

سیکولر اور سیکولرازم خالص مغربی اصطلاحیں ہیں۔لاطینی زبان میں ''سیکولم (seculum) کے لغوی معنی دنیا کے ہیں۔قرون وسطی میں رومن کھیتولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ایک وہ پادری جو کلیسائی ضابطوں کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے۔دوسرے وہ پادری جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے کلیسا کی اصطلاح میں آخرالزکر کو ''سیکولر'' پادری کہا جاتا تھا۔وہ تمام ادارے بھی سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے ماتحت نہ تھے اور وہ جائیداد بھی جسکو کلیسا فروخت کردیتا تھا۔

آجکل سیکولرازم سے مراد ریاستی سیاست یا نظم ونسق کی مذہب سے علیحدگی ہے اور سیکولر تعلیم وہ نظام ہے جس میں دینیات کو تعلیم سے الگ کیا جاتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا امریکانا میں سیکولرازم کی تشریح اور زیادہ وضاحت سے کی گئی ہے ۔انسائیکلوپیڈیا امریکانا کے مطابق ''سیکولرازم ایک اخلاقی نظام ہے جو قدرتی اخلاق کے اصول پر مبنی ہے اور الہامی مذہب یا مابعدالطبعیات سے جدا ہے۔اسکا پہلا کلیہ فکر کی آزادی ہے۔یعنی

ا۔ہر شخص کو اپنے لیے سوچنے کا حق۔

۲۔تمام فکری امور کے بارے میں اختلاف رائے کا حق۔

۳۔تمام بنیادی مسائل پر بحث مباحثے کا حق۔

سیکولرازم یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ موجودہ زندگی کی خوبیوں کے علاوہ کوئی اور خوبی نہیں ہے۔البتہ اسکا مقصد وہ مادی حالات پیدا کرنا ہے جن میں انسان کی محرومیاں اور افلاس ناممکن ہوجائیں۔ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق سیکولرازم اس معاشرتی اور تعلیمی نظام کو کہتے ہیں جس کی اساس مذہب کی بجائے سائنس پر ہو اور جس میں ریاستی امور کی حد تک مذہب کی مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔

سیکولر خیالات بہت قدیم ہیں لیکن سیکولرازم کی اصطلاح جارج جیک ہولی اوک (GEORGE J.HOLY OAKE) نامی ایک انگریز نے 1840 میں وضع کی۔وہ شہر برمنگھم کے میلنکس انسٹیٹیوٹ میں استاد تھے۔برطانیہ کے مشہور خیالی سوشلسٹ رابرٹ اووین (1858-1771) کے ہمنوا ہونے کے جرم میں برطرف کردیا گیا تھا اور کل وقتی مبلغ بن گیا تھا۔ان دنوں لندن سے آزاد خیالوں کا ایک رسالہ ''ندائے عقل'' نکلتا تھا۔1841 میں جب رسالے کے ایڈیٹر کو دین مسیح کی بے حرمتی کے جرم میں ایک سال قید اور سو پونڈ جرمانے کی سزا ہوئی تو ہولی اوک کو رسالے کا ایڈیٹر مقرر کردیا گیا۔لیکن ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ہولی اوک کو بھی ایک تقریر کی پاداش میں چھ ماہ قید کی سزا بھگتنی پڑی۔جیل سے نکلنے کے بعد آزاد خیالی کے حق میں مسلسل تقریریں کرتا اور رسالے لکھتا رہا۔1851 میں اس نے لندن میں ''سینٹرل سیکولر سوسائیٹی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی۔ہولی اوک کا موقف یہ تھا:

ا۔انسان کی سچی رہنما سائنس ہے۔

۲۔اخلاق مذہب سے جدا اور پرانی حقیقت ہے۔

۳۔علم وادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے۔

۴۔ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چاہیے۔

۵۔ہمیں اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سیکولرازم کو معاشرتی نظام کے لیے درست سمجھنے سے دین دار بے دین اور خدا

پرست دہریہ نہیں ہوجاتا۔لہٰذا سیکولرازم سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے معاشرے کو! بلکہ ان اصولوں پر چل کر ہم روشن خیالی، ترقی اور خوشحالی کے مراحل طے کر سکتے ہیں۔سیکولرازم کا مقصد معاشرے کی صحت مند سماجی اور اخلاقی اقدار کو پامال کرنا نہیں ہے بلکہ سیکولرازم ایک ایسا فلسفہ حیات ہے جو خرد مندی اور شخصی آزادی کی تعلیم دیتا ہے۔تقلید و روایت پرستی کے بجائے عقل و علم کی اجتہادی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ہمہ وقت اس کوشش میں رہتی ہے کہ انسانی عمل وفکر کو توہمات کی جال سے نکالا جائے۔جو لوگ عقل و اجتہاد کی جگہ تقلید و اطاعت پر زور دیتے ہیں وہ خود مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔زرا سوچیے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ روایت پرستی کا شیوہ اختیار کرتا اور اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتے اور اسکو عقلی دلائل سے رد نہ کرتے تو دین ابراہیمی کہاں سے ہوتا؟

سیکولرازم کی بنیاد اس کلیے پر قائم ہے کہ ضمیر وفکر اور اظہار رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔لہٰذا ہر فرد بشر کو اسکی پوری پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل پر خواہ انکا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب و اخلاق سے، فلسفہ وحکمت سے ہو یا ادب وفن سے ،اپنے خیالات کی بلا خوف وخطر ترویج کرے۔طاقت کے زور سے کسی کا منہ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا حقوق انسانی کے منافی ہے۔خوف، خوف سے بزدلی، بزدلی سے تابعداری اور تابعداری سے غلامانہ زہنیت جنم لیتی ہے۔فکر وعمل کی قوانینِ قدرت سے ہم آہنگی کا نام سیکولرازم ہے۔اور اگر قوانینِ قدرت کی خلاف ورزی کی جائے تو انسان کو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔انسانی تخلیق کا ہر عمل چونکہ قوانینِ قدرت کے مطابق ہوتا ہے لہٰذا شعر کہنا، تصویر بنانا، ہوائی جہاز اڑانا ہم اپنے کاموں کے دوران سیکولر انداز اپنانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے عمل کی

زمہ داری ہم پر ہے اور اس میں کسی ماورائی طاقت کا دخل نہیں ہے۔ بیماریوں کا علاج اور حفظانِ صحت کے طور طریقے بھی سیکولر اصولوں پر وضع ہوتے ہیں۔ مگر پرانے زمانے میں انسان قوانینِ قدرت سے بہت کم واقف تھا لہٰذا مظاہرِ قدرت سے ڈرتا تھا۔انکی پوجا کرتا تھا اور انکے لطف وکرم کا طالب ہوتا تھا۔ کانسی کی تہذیب کے زمانے میں وادیِ نیل، وادیِ دجلہ وفرات میں بڑی بڑی تہذیبیں ابھریں اور انسان نے اپنی راحت وآرام کے لیے بے شمار نئی نئی چیزیں بنائی لیکن اسکا شعور ہنوز تجرباتی تھا، استدلالی نہ تھا۔وہ اپنی ایجادوں اور دریافتوں سے کوئی سائنسی نظریہ اخذ نہ کرسکا۔اسکا عمل سیکولر تھا لیکن اسکی سوچ سیکولر نہ تھی۔

مغرب میں سیکولر خیالات کی ابتدا آئیونا (مغربی ترکی) کے نیچری فلسفیوں سے ہوئی جو یونانی الاصل تھے۔طالیس، انکسی ماندر، ہرقلاطیس اور دیمقراطیس وغیرہ مظاہرِ قدرت کی تشریح خود عناصر قدرت کے حوالے سے کرتے تھے۔کسی نے کہا کہ کائنات کا اصل اصول پانی ہے، کسی نے کہا نہیں آگ ہے، کسی نے کہا ہوا ہے اور کسی نے کہا ایٹم ہے۔ان میں بیشتر یونانی خداؤں کے قائل تھے لیکن دنیاوی حقیقتوں کی تشریح وہ سیکولر انداز میں کرتے تھے۔یونان کی شہری ریاستوں بالخصوص ایتھنز کا نظام ریاستن بھی سیکولر تھا۔یونان کے زوال کے بعد جب مغربی سیاست کا مرکز روم منتقل ہوگیا تو نظم ونسق کے تقاضوں کے سبب اربابِ اختیار کو وہاں بھی سیکولر طرزِ عمل اختیار کرنا پڑا۔ 451ءق۔م میں جب روم میں پروہتوں کی دراز دستیوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو رومن سینٹ نے قوانین کو ''بارہ لوحوں'' میں قلم بند کرکے اپنے تحویل میں لے لیا اور تب رومن لاء کا سیکولر دور شروع ہوا۔پہلی صدی عیسوی میں رومی معاشرے میں ایک نیا مشرقی عنصر داخل ہوا جس نے یورپ والوں کی زندگی پر گہرہ اثر ڈالا۔ یہ عنصر عیسائی مذہب کا تھا۔حضرت مسیح کا حکم تھا کہ خدا کا حق خدا کو دو اور قیصرِ روم کا حق قیصرِ روم کو دو۔انکے شاگردوں نے پیغمبرِ خدا کی ہدایت پر عمل کیا مگر قیصرِ روم کو مسیحی تعلیمات ہرگز گوارہ نہ تھیں۔چنانچہ پطرس اور پال نے جب روم میں تبلیغ شروع کی تو انکو صلیب دے دی گئی دوسرے کئی مبلغوں کا بھی یہی حشر ہوا اور عام عیسائیوں پر جو عموماً غریب یا غلام ہوتے تھے ہولناک مظالم توڑے گئے۔تقریباً 300 سال تک یہی عالم رہا لیکن بیداد کے باوصف عیسائی مذہب کی مقبولیت بڑھتی رہی اور آخر کار شہنشاہ قسطنطین (337-274ء) کو اعلان کرنا پڑا کہ ''عبادت کی آزادی سے کوئی شخص محروم نہیں کیا جائیگا اور ہر فرد کو اختیار ہوگا کہ الوہی امور کا تصفیہ اپنی مرضی سے کرے'' لیکن 313ء میں جب قسطنطین خود عیسائی ہوگیا تو غیر مسیحی آبادی پر ستم ڈھایا جانے لگا۔ 346ء میں تمام غیر مسیحی عبادت گاہیں بند کردی گئیں پرانے رومن دیوتاؤں کو قربانی پیش کرنے کی سزا موت قرار پائی اور عبادت گاہوں کی جائیداد ضبط کرکے کلیساء کے حوالے کردی گئیں۔جو کل تک مظلوم ومفلس تھے دفعتاً صاحبِ جاہ وحشم

بن گئے۔

مغربی مورخین قرونِ وسطٰی کو عہدِ تاریک سے تعبیر کرتے ہیں۔ انکے نزدیک پانچویں صدی اور پندرھویں صدی کا درمیانی زمانہ معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے لحاظ سے انتہائی پستی کا زمانہ تھا۔لیکن معاشرتی ادوار کا سن وسال متعین نہیں کیا جاسکتا۔ معاشرتی دور کوئی تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ارتقائی عمل ہے جسکی ابتدا یا انتہا کی نشاندہی ممکن نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ قرونِ وسطٰی کی شام آہستہ آہستہ ہوئی اور نئی زندگی کی پو آہستہ آہستہ پھٹی۔ چنانچہ یورپ میں سیکولر اداروں اور فکروں کی نشوونما تیرھوی صدی عیسوی میں شروع ہوگئی تھی، یہ بڑی تاریخ ساز صدی تھی، اسی صدی میں اٹلی میں ابھرتے ہوئے سرمایہ داری نظام نے طاقت پکڑی اور سیکولر افکار مسلم اسپین اور سسلی کی راہ سے یورپ میں داخل ہوئے۔مگر تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس مذہب کے عظیم دانشوروں، الکندی، ابوبکر رازی، بوعلی سینا، ابن الہیثم، خوارزمی، البیرونی اور ابنِ رشد نے مغرب کو سیکولر خیالات اور نظریات کی تعلیم دی، اسی مذہب کے نام لیوا آج سیکولرازم پر اسلام دشمنی کی تہمت لگا رہے ہیں۔

انگریز مؤرخ پروفیسر فشر کو اس بات پر بڑی حیرت ہے کہ ''سیکولر خیالات اٹلی میں شروع ہوئی جو کلیسائیت کا سب سے مضبوط قلعہ تھا۔ تیرھویں صدی کی فکری تحریکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ الٹی بات ہے کہ اٹلی جو کلیسا کا مرکز تھا۔ پورے تاریخی دور میں مغربی ملکوں میں سب سے زیادہ سیکولر تھا'' لیکن یہ ہرگز الٹی بات نہیں بلکہ سیدھی بات ہیکہ جنگ صلیبیہ کے دوران صنعت وحرفت اور تجارت نے دوسرے تمام مغربی ملکوں سے پہلے اٹلی میں ترقی کی۔ سیکولر درسگاہوں کی ابتدا اگر اٹلی میں ہوئی تو یہ بھی کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ صنعت وتجارت کی ترقی کا تاریخی تقاضہ تھا۔اٹلی کے بینکروں، جہاز سازوں اور ریشمی واونی مِلوں کے مالکوں کو تربیت یافتہ اور ہنرمند کارکنوں کی ضرورت پڑتی تھی مگر تعلیمی ادارے کلیسا کے ماتحت تھے جو فنی تعلیم کے سخت خلاف تھا لہٰذا سرمایہ دار طبقے کو مجبوراً سیکولر درسگاہیں قائم کرنی پڑیں۔کلیسا نے اس اقدام کی شدت سے مخالفت کی مگر اسکی ایک نہ چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے اٹلی کے قریب قریب ہر بڑے شہر میں سیکولر یونیورسٹیاں کھل گئیں۔ان یونیورسٹیوں کو سیکولر اداروں نے سیکولر تعلیمات کی غرض سے قائم کیا تھا۔لہٰذا ان درسگاہوں کا ماحول قدرتی طور پر کلیسا کے خلاف تھا۔ بولونیا یونیورسٹی میں تو دینیات کا شعبہ ہی نہ تھا۔ پیڈوا یونیورسٹی فکرِ جدید کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ فاورنس میں چھ ٹیکنیکل سکول قائم تھے جن میں طلباء کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی۔سالرمو یونیورسٹی طبی تعلیم کے لیے پورے یورپ میں مشہور تھی۔

ان یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے نوجوانوں کی معاشرتی قدریں سیکولر تھیں۔دوسرا اہم رجحان جس سے سیکولر عناصر کو تقویت ملی شرعی قوانین کی جگہ سول قوانین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت تھی۔اس رجحان کو بھی اٹلی کی جمہوری حکومتوں ہی نے سہارا دیا۔اسی زمانے میں فرانس، بیلجیئم اور برطانیہ میں بھی تجارت اور صنعت وحرفت کو فروغ ملا۔ مارسلز، پیرس، ایمسٹرڈم، ہمبرگ اور لندن میں صنعتی اور تجارتی اداروں کی تعداد بڑھنے لگی، سیکولر درسگاہیں قائم ہوئیں اور پرانی یونیورسٹیوں میں بھی جو کلیسا کے زیر اثر تھے سیکولر خیالات کا چرچا شروع ہوگیا۔ برطانیہ میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں پر ہنوز کلیسا کا غلبہ تھا لہٰذا سول قانون کی تعلیم کے لیے لندن کے کاروباری حلقوں نے اپنے شہر میں جداگانہ لاء کالج قائم کئے جو آج تک INN ''سرائے'' کہلاتے ہیں اور پاکستان وانڈیا کے بیرسٹرز وہیں سے سند لیتے ہیں۔

یورپ میں سیکولر خیالات کو فروغ دینے میں عرب مفکرین نے بھی بڑا تاریخی کردار ادا کیا تھا۔

قرونِ وسطٰی کے جن مسلمان حکما نے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں ابوبکر رازی (وفات 925ء) اور ابن رشد (1126-1198ء) کے نام سر فہرست ہیں۔

رازی اسلاف پرستی کے سخت خلاف ہے۔ وہ منقولات کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ عقل اور تجربے کو علم کا واحد ذریعہ سمجھتا ہے اسکی سوچ کا انداز عوامی تھا وہ کہتا تھا کہ عام لوگ بھی اپنے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور سائنسی سچائیوں کے ادراک کے اہل ہیں۔اسکا قول تھا کہ ہم کو مذہب پر تنقید کا پورا حق حاصل ہے۔ وہ معجزوں کا منکر تھا کیونکہ معجزے قانون قدرت کی نفی کرتے ہیں اور خلافِ عقل ہیں۔ وہ مذاہب کی صداقت کا بھی چنداں قائل نہیں تھا کیونکہ مذاہب عموماً حقیقتوں کو چھپاتے ہیں اور لوگوں میں نفرت وعداوت پیدا کرتے ہیں۔ وہ معاشرے کے بارے میں افلاطون کی کتاب ''تماؤس'' کے ارتقائی تصور سے اتفاق کرتا تھا اور اقتصادی پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے تقسیم کار کی افادیت پر زور دیتا تھا۔طبیب تو ابن رشد بھی تھا لیکن یورپ میں اسکی شہرت کی وجہ فلسفہ تھا بلخصوص ارسطو کی

شرحیں۔ابن رشد بارہویں صدی سے سولہویں صدی تک یورپ میں سب سے غالب مدرسہ ءمفکر تھا حالانکہ عیسائی پادری اسکے سخت خلاف تھے ۔ابن رشد تعلیمات کالب ولباب یہ تھا:

ا۔کائنات اور مادہ ابدی اور لافانی ہیں۔

۲۔خدا دنیاوی امور میں مداخلت نہیں کرتا۔

۳۔عقل لافانی ہیں اور علم کا زریعہ ہیں۔

فرانس میں رشدیت کا سب سے بڑا علمبردار پیرس یونیورسٹی کا پروفیسر سیگر(1281-1235ء) تھا اس پر مذہبی عدالت میں مقدمہ چلا اور عمر قید کی سزا ملی۔اسیری کے دن اس نے روم میں گزارے اور وہیں قتل ہوا۔ان سختیوں کے باوجود ابن رشد کے خیالات ذہنوں کو متاثر کرتے رہے یہاں تک کہ ولڈ یورنٹ کے بقول ''تیرویں صدی کے وسط میں ابن رشدیت تعلیم یافتہ طبقے کا فیشن بن گئی۔

معتزلہ کے زیر اثر فرانس میں ایسے مفکر بھی پیدا ہونے لگے جو کہتے تھے کہ خدا نے کائنات کی تخلیق کے بعد نظام کائنات کو قوانینِ قدرت کے سپرد کر دیا ہے لہٰذا معجزہ محال ہے۔انکا دعوٰی تھا کہ دعاؤں،تعویزات سے عناصرِ قدرت کے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔التجاؤں سے نہ طوفان کو روکا جاسکتا ہے نہ بارش لائی جاسکتی ہے اور نہ بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے۔نباتات اور حیوانات کی نئی قسمیں عملِ تخلیق کا کرشمہ نہیں بلکہ قدرتی ارتقاء کا نتیجہ ہیں اور یہ عقیدہ کے قیامت کے دن مردے جی اٹھیں گے درست نہیں کیونکہ روح اور جسم دونوں فانی ہیں۔

چودھویں صدی میں قومی ریاستوں کے قائم ہونے سے سیکولر خیالات خوب پھلے پھولے۔قومی ریاستوں کو کلیسا کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے جن دلیلوں کی ضرورت تھی وہ سیکولر مفکر ہی فراہم کر سکتے تھے۔مثلاً پیڈووا یونیورسٹی کے استاد مارسی لیو نے اٹلی کی شہری ریاستوں کو نمونہ بنا کر 1334ء میں سیکولر ریاستوں کا ایک مبسوط نظریہ پیش کیا۔اس نے شرعی قوانین اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''شہریوں کے حقوق انکے عقائد سے متعین نہیں ہوتے لہٰذا کسی شخص کو اسکی مذہب کی بنا پر سزا نہیں ملنی چاہیئے'' کلیسا کی قائم کردہ مذہبی عدالتوں پر یہ کھلا حملہ تھا۔کلیسا کا زوال اب دور نہیں تھا چنانچہ جلد ہی ایسی تحریکیں اٹھیں اور پے در پے ایسے اہم واقعات پیش آئے جو سیکولر خیالات کے حق میں بے حد سازگار ثابت ہوئے۔یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا ظہور ،مارٹن لوتھر،کالون اور زوینگلی وغیرہ کی پوپ کے خلاف بغاوتیں،برطانیہ میں ہنری ہشتم کا رومن کلیسا سے تصادم،سائنسی ایجادوں میں اضافہ،صنعت وحرفت کا بڑے پیمانے پر فروغ ،امریکہ وہندوستان کی دریافت اور اسکی وجہ سے بین الاقوامی تجارت وصنعت میں اضافہ،برطانیہ میں خانہ جنگی اور جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں بادشاہ چارلس اول کا قتل،الوہی استحقاقِ ملوکیت کے نظریے سے بیزاری اور پارلیمانی نظام سے وابستگی غرضِ کہ معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں سیکولر میلان عام ہوگیا۔سترھویں صدی میں جو عقلیت کا عہد کہلاتا ہے سیکولر رجحانات کو مزید تقویت ملی۔اسی بنا پر پروفیسر آرنلڈ ٹوائن بی نے لکھا ہے کہ ''سترھویں صدی مغربی زندگی پر سیکولرازم کی بالادستی کی صدی ہے ۔سیکولرازم ہی کے طفیل مغربی معاشرے میں معاشی مفاد میں اور تحقیق وتفتیش کے دائرے میں سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی۔

اٹھارھویں صدی یورپ میں صنعتی انقلاب ،سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کے عروج کی صدی تھی۔والتیر ،روسو،مانٹس کیو،اولباخ،ایلواتیس،دیدرو،کانٹ اور بے شمار ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرتی اقدار وافکار کا رخ ہی بدل دیا اور جب عوام کی انقلابی جہد(امریکہ اور فرانس میں) شروع ہوئی تو سیکولر خیالات نے عملی پیراہن پہن لیا۔

امریکی جنگِ آزادی کی قیادت وہاں کے صنعت کاروں اور تاجروں نے کی تھی ان طبقوں پر اور انکی فکری نمائندوں پر جیمس میڈیسن،تھامس جیفرسن،ٹام پین اور بنجامن فرینکلن کے علاوہ برطانوی سیاسی مفکر جان لاک اور فرانسیسی خردافروزوں کا گہرہ اثر تھا۔انہوں نے امریکی ریپبلک کی بنیاد سیکولر اصولوں پر رکھی۔ چنانچہ امریکہ کا نیا آئین جو 1789 میں منظور ہوا خالص سیکولر آئین تھا۔ یہ آئین ہنوز رائج ہے۔اس کے مطابق اقتدارِاعلٰی کا سرچشمہ ملک کے باشندے ہیں۔آئین کی دفعہ چھ کے تحت ریاست کے کسی عہدے کے لیئے مذہب کی کوئی شرط نہیں۔

تاریخی اعتبار سے امریکہ عہدِ جدید کی پہلی سیکولر ریاست ہے۔مگر جس سماجی انقلاب کی وجہ سے سیکولر اداروں کے فکروں کے اثرات یورپ اور ایشیا میں نمایاں ہوئے وہ فرانس کا عظیم انقلاب تھا۔اس کے باعث یورپ میں ملوکیت ، فیوڈلزم اور کلیسا کی بالادستی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔اس کے بعد یورپ کے قریب قریب

ہر ملک میں معاشرے اور ریاست کی تشکیل سیکولر خطوط پر ہونے لگی۔ لیکن سیکولرازم کو پوری طرح رواج پانے میں ایک صدی لگی اور مغربی قوموں نے بڑی جدوجہد کے بعد پہلی بار وہ حقوق حاصل کیے جو سیکولرازم کی جان ہیں۔ مثلاً تحریر و تقریر کی آزادی، ضمیر و فکر کی آزادی، پریس کی آزادی، تنظیمیں بنانے کی آزادی اور اختلافِ رائے کی آزادی ورنہ جاگیری دور میں تو کسی نے ان حقوق کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

یورپ اور امریکہ میں سیکولر ریاستوں کے قیام سے لوگ لا مذہب نہیں ہوئے نہ گرجا گھر ٹوٹے اور نہ پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں میں چنداں فرق آیا۔ البتہ ہر شخص کو پہلی بار اس بات کا موقع ملا کہ وہ دوسرے مسائل کی مانند مذہبی مسائل پر بھی بلاخوف و خطر غور کریں اور جو عقائد و رسوم خلافِ عقل نظر آئیں انکو رد کر دیں۔ سیکولر دور میں یہ وحشیانہ مظالم بند کر دیے گئے اور پادری و ملا حضرات کو بھی اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑا، اب وہ لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے بجائے اخلاق و محبت سے پیش آنے پر مجبور ہوئے۔

مشرقی ملکوں میں سیکولر خیالات کی نشوونما اٹھارویں صدی میں ہوئی۔ روشن خیالی کی یہ لہر ترکی اور ایران میں براہِ راست مغربی روابط سے آئی۔ مصر میں نپولین کے حملے کے دوران اور ہندوستان میں بنگال، بہار اور آگرہ دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کے بعد۔

سلطانِ سلیمان اعظم (1520-1560) کا عہد سلطنت عثمانیہ کا نقطۂ عروج تھا۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا فرمان روا تھا۔ جو ہنگری سے یمن اور بغداد سے مراکش تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی رعایا میں مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ ترک، عرب، کرد، سلاف، مجیار، بربر، یہودی، عیسائی اور مسلمان۔ عروج کا یہ دور تقریباً دو سو سال تک جاری رہا۔ 1683 میں وینا (آسٹریا) پر ترکوں کے دوسرے حملے کی ناکامی زوالِ سلطنت کی تمہید ثابت ہوئی۔ پہلے ہنگری ہاتھ سے نکلا (1699) پھر کریمیا اور گرجستان اس کے بعد بلغاریہ، یوگوسلاویہ، یونان، البانیہ، قبرص، الجزائر، لیبیا، کریٹ اور مصر۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغرب کی سامراجی طاقتوں نے عراق، عرب، شام اور فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب ترکی کے پاس اناطولیہ کے علاوہ سالونیکا کا تھوڑا سا ساحلی علاقہ پرانی تسخیرات کی واحد نشانی رہ گیا۔ سلطنت کی طرزِ تعمیر ہی میں اس کی خرابی مضمر تھی۔ سترھویں صدی میں جب یورپ میں جدید صنعت و تجارت نے بڑے پیمانے پر ترقی کی اور فیوڈل نظامِ فکر و عمل کی جگہ نیشنلسٹ جمہوری اور سیکولر اداروں نے قوت پکڑی تو عثمانی سلطنت جس کی بنیاد فیوڈلزم اور عسکری طاقت پر قائم تھی یورپ کی ابھرتی ہوئی سرمایہ دار طاقتوں کا مقابلہ نا کر سکی۔ نہ معاشرتی طور پر نہ فکری طور پر۔

خالدہ ادیب خانم ترکی کی ذہنی پسماندگی اور قدامت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ''جس وقت مغرب نے روایت پرستی کی زنجیروں کو توڑا اور نئے علم اور سائنس کی طرح ڈالی تو اسکا اثر یہ ہوا کہ دنیا کی شکل بدل گئی مگر اسلام کا مذہبی جسد اپنے تعلیمی فرائض کی ادائیگی میں سراسر ناکام رہا۔ علماء اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ انسانی علم و حکمت تیرھویں صدی سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ انکا یہ اندازِ فکر انیسویں صدی تک بدستور قائم رہا۔ عثمانی علماء نے ترکی میں نئی فکر کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا وہ جب تک مسلم قوم کی تعلیم کے نگراں رہے انہوں نے اسکا پورا پورا بندوبست کیا کہ تعلیمی نصاب میں کوئی نئی فکر داخل نہ ہونے پائے لہٰذا علم پر جمود طاری ہو گیا۔ مزید برآں یہ حضرات ملکی سیاست میں اس درجہ الجھے ہوئے تھے کہ انکو اصلاحات پر غور کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ مدرسے وہیں رہے جہاں وہ تیرھویں صدی میں تھے'' اٹھارویں صدی کی ابتدا میں مغربی طاقتوں کے ہاتھوں پے در پے شکست کے بعد جب ترکی یورپی اقوام کو تجارتی، قانونی اور مذہبی مراعات دینے پر مجبور ہوا، ترکی میں انکے دفاتر اور تجارتی مراکز قائم ہوئے، مغربی حکومتوں سے ترکی کی راہ رسم بڑھی تو اس بدی سے نیکی کی صورتیں بھی پیدا ہونے لگیں۔ مغربی سیاست کو سمجھنے کے لیے مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی زبان اور تہذیب سے واقفیت ضروری ہو گئی۔ اس طرح اصحابِ سیف اور اصحابِ مذہب کے مقابل ''اصحابِ قلم'' کا ایک نیا گروہ آہستہ آہستہ پیدا ہوا جو مغربی افکار و علوم سے قدرے آگاہ تھا۔ اور مغربی تمدن کو قبول کرنے ہی میں ترکی کی نجات دیکھتا تھا۔ یہ گروہ صدقِ دل سے یہ محسوس کرتا تھا کہ مشرقی اور اسلامی ورثاء نئے حالات اور نئے خطرات کا مقابلہ کرنے میں عثمانیوں کی مدد نہیں کر سکتا لہٰذا ہمیں مغربی تمدن و تہذیب اختیار کرنا چاہیے۔ یہ رجحان سلطان احمد (1707-1730) کے دور میں جسکو ''عہدِ لالہ'' کہتے ہیں، سلطان کے داماد اور صدرِ اعظم ابراہیم پاشا کی کوششوں سے ابھرا۔ مگر سیکولر خیالات کی نشر و اشاعت روایت پرست ملاؤں کو سخت ناگوار گزری وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ عوام میں اچھے برے کا شعور پیدا ہو اور

وہ عقل سے کام لیں۔انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جدید علوم کی تعلیم کا مقصد لوگوں کو دراصل عیسائی بنانا ہے۔اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا ہے۔یہ اصلاحات ''جانثاروں'' کے مفاد کے خلاف تھیں لہٰذا انھوں نے ملاؤں کی شہ پا کر بغاوت کر دی،سلطان احمد برطرف ہوا۔صدرِاعظم ابراہیم داماد اور امیر البحر مصطفٰی پاشا کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔محمد فیضی چیلپی اور سعید محمد قبرص میں جلاوطن کر دیے گئے۔ابراہیم متفرقہ کا چھاپہ خانہ بند ہوگیا۔خالدہ ادیب خانم کے بقول ترکی کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز سلطان سلیم سوئم (1787-1807) کے عہد میں ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا جب انقلاب فرانس کے نعروں سے سارا یورپ اور امریکہ گونج رہا تھا معاشرتی اور فکری ہیجان انتہا کو پہنچ چکا تھا اور فرانسیسی روشن خیالوں کے نظریات کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا۔سلطان سلیم انقلاب فرانس سے بے حد متاثر تھا مگر اصلاحات ہی اسکا مقصد نہ تھیں بلکہ وہ جدید اصولوں پر نئی ریاست قائم کرنے کا خواہش مند تھا انہی اصلاحات کی وجہ سے پرانی فوج،افسر شاہی اور علما تینوں انکے دشمن ہوگئے اور سلطان کو قتل کر دیا گیا۔اسکے بعد سلطان محمود دوئم (1808-1839) سطان شہید کا چچا زاد بھائی تھا کا دور شروع ہوا وہ انکے خیالات سے پورا پورا اتفاق کرتا تھا البتہ وہ سلطان سلیم سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوا ہے وہ سترہ برس تک جانثاروں سے نباہ کرتا رہا۔اسی اثناء میں اس نے عام لوگوں سے ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی،وہ ان میں گھل مل کر انکی فریادیں سن کر انکی دلجوئی کرتا چنانچہ لوگ اسکو پیار سے محمود عدلی کہنے لگے۔تب اسنے موقع پا کر 1826 میں جانثاروں کا قلع قمع کر دیا اور حکومت کا نیا ڈھانچہ بنایا جسکی روح سے صدر اعظم کا عہدہ منسوخ ہوگیا۔نظم ونسق کے مختلف شعبوں کے لیے وزرا مقرر ہوئے اور انکی مجموعے کو بابِ عالی کا لقب دیا گیا۔شیخ الاسلام کو اس نئی وزارتی تنظیم میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ فرمان صادر ہوا کہ علماء آئندہ سیاست میں حصہ نہ لیں۔1838 میں سلطان نے مدرسوں کے متوازی نئے سکول مغربی طرز پر قائم کیئے جن میں زریعہ تعلیم فرانسیسی زبان تھی اور سائنسی علوم کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔اس نے جدید طرز کی ملٹری اکیڈمی اور میڈیکل کالج بھی قائم کیئے اور انکے لیے استاد آسٹریا سے بلوائے مگر علماء نے سرجری کے تعلیم کی سخت مخالفت کی اور مردہ جسموں کی چھیر پھاڑ کو ناجائز قرار دیا۔لہٰذا سرجری سکھانے کے لیے موم کے مجسمے استعمال کرنے پڑے۔ملاؤں نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ یہ بحث چھیڑ دی کہ زمین گول ہے کہ نہیں،وباؤں سے بچنا چاہیئے یا تقدیر پر بھروسہ کرنا چاہیے اور یہ کہ چیچک کا ٹیکہ جائز ہے یا ناجائز۔لیکن سلطان نے ان اڑنگوں کی پرواہ نہ کی اس نے پہلی بار ڈیڑھ سو نوجوان ترکوں کو یورپ بغرض تعلیم بھیجا ایک دارالترجمہ قائم کیا جس میں سید عثمان صاحب اور مصطفٰی بہجت کی نگرانی میں سائنسی علوم کی مغربی کتابیں ترکی میں ترجمہ ہونے لگیں وغیرہ۔

اسکے بعد سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید دوئم کے عہد ظلمت میں ملائیت اور مخبری کا کاروبار خوب چمکا۔حمیدی دور میں سرکاری طور پر تین رجحانات کی حوصلہ افزائی کی گئی۔روایتی اندازِ فکر،مغربی خیالات کی شدت سے مخالفت اور اتحاد اسلام۔روایت پرست حلقوں کا کام یہ تھا کہ ماضی کے کارناموں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کریں،اسلاف پرست کو ہوا دیں،مناظرے کا لٹریچر شائع کریں اور قران و حدیث سے یہ ثابت کریں کہ سلطان کی اطاعت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے،نا انصافی و دھوکے سے حالات اتنے خراب ہوگئے کہ جولائی 1908 میں فوج کی تیسرے کو نے جس میں اتاترک بھی شامل تھے بغاوت کی اور سلطان حمید کو برطرف کر دیا۔اب حکومت کی بھاگ دوڑ نوجوان ترکوں نے سنبھال لی اور نیا سلطان محمد شاد پنجم برائے نام سلطان رہ گیا۔نوجوان ترکوں کے عہد میں (1908-1919) ترکی کی فکر اور سیاست میں تین رجحان نمایاں ہوئے۔پہلا روایتی رجحان،دوسرا گروہ توران پسندوں کا تھا جو عثمانی سلطنت کو نسلی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے۔جب کہ تیسرا حلقہ نیشنلسٹوں کا تھا۔نیشنلسٹوں کا سیاسی مفکر اور نظریاتی ترجمان ضیا گوکلپ (1875-1924) تھا۔اس نے سمجھا کہ فقط سیاسی تبدیلیاں کافی نہیں بلکہ ترکی کو سماجی اور تمدنی انقلاب کی بھی ضرورت ہے وہ مغربی تمدن کو اختیار کرنے کے حق میں تھا،بشرطیکہ اس تمدن کو ترکی کی دو تاریخی روایات ترکی تہذیب اور اسلام سے ہم آہنگ کیا جائے یعنی ترکی کا تمدن مغربی ہو،مذہب اسلام اور تہذیب خالص ترکی۔اور تینوں کو آپس میں گڑمڑ نہ کیا جائے۔ضیا گوکلپ کا خیال تھا کہ روایات پرست حلقے تہذیب اور تمدن میں فرق نہیں کرتے حالانکہ دونوں الگ الگ حقیقتیں ہیں۔''تہذیب کسی قوم یا ملت کی سماجی قدروں کی نمائندگی کرتی ہے وہ قومی یا ملی ہوتی ہے۔جبکہ تمدن نام ہے معاشرتی تنظیم اور سماجی اداروں کے مجموعے کا۔مثلاً نظم ونسق کے اصول،ضروریاتِ زندگی کے حصول کے طریقے،شہری حقوق جمہوریت اور ملوکیت وغیرہ۔تمدن معاشرے کا

شعوری عمل ہے اسکے برعکس تہذیب افراد کے شعوری عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ مصنوعی طور پر پیدا کی جاسکتی ہے۔ گوکلپ کے نزدیک کسی قوم کی تہذیب کی روح اسکی زبان ہوتی ہے جس سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ زبان کے حوالے سے تہذیب اور تمدن کے فرق کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ فقروں کی بناوٹ کے اصول اور افعال (کھانا، پینا، سونا، جاگنا) تہذیب کی علامتیں ہیں جو افراد کی مرضی کے تابع نہیں البتہ اصلاحیں مصنوعی ہوتی ہیں جو تمدن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ضیا گوکلپ روایت پرستوں کے اس دعوے کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اسلام ایک تمدن ہے اور یہ کہ مغربی تمدن اور عیسائیت ایک ہیں۔ کیونکہ مذہب کا کوئی تعلق تمدن ہے نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمدن اخلاقی قدروں کا پابند نہیں ہوتا بلکہ واقعاتی حقیقت ہوتا ہے لہٰذا مغربی تمدن کا کوئی واسطہ مذہب سے نہیں ہے۔ ضیا گوکلپ کا کہنا ہے کہ اسلام نے ہم کو پوری آزادی دے رکھی ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں کے پیش نظر جو تمدن چاہیں اختیار کریں۔ علمائے دین پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حضرات جو شریعت کی بحالی پر اصرار کرتے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ اسلامی فقہ تمدنی معروضے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے تھیوکریٹک ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔ یہ حضرات اسلام کی آفاقی سچائیوں اور ان حقیقتوں کے درمیان فرق کرنے میں ناکام رہے ہیں جنکا تعلق امت کی وقتی ضرورتوں سے تھا۔ جدید تمدن صنعتی انقلاب کا آوردہ پروردہ ہے لہٰذا فقہ جو پرانے تمدن کی نمائندہ ہے جدید تمدن سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں امت کے تصور کو بھی ملت کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ امت بین الاقوامی مذہبی جمعیت ہے۔ جبکہ ملت کی بنیاد وطن ہے (ترک، ایران و پاکستانی دانشور ملت کی اصطلاح کو قوم اور وطن کے معنی میں استعمال کرتے ہیں) وہ ترکوں کو ایک ملت قرار دیتا ہے اور اس ملت میں عربوں کو شامل نہیں کرتا اور ان ترکوں کو جو ترکی کی حدود سے باہر ترکستان یا ایران میں آباد ہیں کیونکہ ضیا گوکلپ کے نزدیک ملت کی بنیاد نسل نہیں ہے بلکہ وطنی تہذیب ہے۔ انقلابِ ترکی اور کمال اتاترک کی جمہوریہ ترکی کی صدارت پر براجمان ہونے کے بعد 1922ء کو قومی اسمبلی نے بادشاہت کے خاتمے کا اعلان کر دیا اکتوبر 1923ء کو نیا آئین منظور ہوا۔ مارچ 1924ء میں اسمبلی نے خلافت کا عہدہ منسوخ کر دیا اور مذہب کو ریاست سے الگ کرنے کی غرض سے متعدد قوانین منظور کیے۔ ترکی کی نئی ریاست سیکولر ہوگئی چنانچہ ترکی کے نئے آئین میں وضاحت کر دی گئی کہ ''ترکی ریپبلک ایک نیشنلسٹ، جمہوری، سیکولر اور سوشل ریاست ہے جس پر انسانی حقوق پر مبنی قانون کی حاکمیت ہے'' مگر کمال اتاترک کی آنکھیں بند ہونے کے بعد انکے جانشینوں نے انقلاب ترکی کی نصب العین کو بالائے طاق رکھ دیا وہ ملک کو صنعتی اعتبار سے خودکفیل نہ بنا سکے وہ یہ بھول گئے کہ مغربی تمدن کوٹ پتلون پہننے اور کانٹے چھری استعمال کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ مغربی تمدن کا انحصار جیسا کہ نامک کمال اور ضیا گوکلپ نے بار بار تنبیہ کی تھی جدید صنعت وحرفت اور سائنسی ٹیکنالوجی کو فروغ دینے پر ہے، شہری حقوق کو عام کرنے پر ہے جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے پر ہے۔ ترکی کے نئے حکمرانوں نے ان فرائض کی بجا آوری کے بجائے یورپ کی فاشسٹ قوتوں سے ناتا جوڑا اور ترقی پسند عناصر پر تشدد کرنے لگے۔ ترکی ہٹلر کے گماشتوں کا اڈہ اور سازشوں کا مرکز بن گیا دوسری جنگ عظیم میں فاشسٹوں کو شکست ہوئی تو ترکی سیاست نے امریکہ کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی اور ترکی معیشت امریکہ کی فوجی اور مالی امداد کی دست نگر ہوگئی۔ اب ہر جگہ امریکہ کے فوجی اور ہوائی اڈے قائم ہیں اور ترکی کی خارجی اور داخلی پالیسی کا دامن امریکہ سے بندھا ہوا ہے اسی عاقبت نااندیشی کا نتیجہ ہے کہ ترکی گزشتہ چوتھائی صدی سے مسلسل سیاسی اور اقتصادی بحران میں مبتلا ہے۔ اقتدار پر فوج کا قبضہ ہے، شہری آزادی مفقود ہے جمہوریت کا نام ونشان باقی نہیں اور سیکولرازم کے مخالفین کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ 27MAY1498 کی وہ ساعت کبھی نہ بھولے گی جس وقت پرتگالی جہاز رانوں نے واسکوڈی گاما کی قیادت میں سائل ملابار پر لنگر ڈالے اور کالی کٹ کے راجہ زمورن سے تجارتی تعلقات قائم کیے۔ پرتگالیوں نے جلد ہی گوا پر قبضہ کر لیا جو سلطنت بیجاپور کی اہم بندرگاہ تھی اور رفتہ رفتہ دمن، دیو، سالسیٹ، بسین، چول، بمبئی اور بنگال میں ہگلی کے بھی مالک ہوگئے۔ انہوں نے گوا میں اپنا پریس لگایا جس میں مذہبی کتابیں چھپتی گئیں اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگے۔ مقامی لوگوں کے ساتھ انکا سلوک نہایت ظالمانہ تھا۔ اپنے تجارتی حریفوں کو شکست دے کر بحرِ ہند میں انکا عمل دخل بڑھا۔ سولھویں سترھویں صدی میں مغل شہزادوں، شہزادیوں اور عمائدین سلطنت کو بھی حج و زیارت کے لیے پرتگالی جہازوں پر سفر کرنا پڑھتا تھا۔ انگریزوں نے پرتگالیوں کے سو سال بعد ہندوستان کا رخ کیا۔ انہوں نے 31 دسمبر 1200 کو لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی

قائم کی ۔ 1208 میں انکا تجارتی نمائندہ یہاں آیا مگر انگریزوں کو پانچ سال بعد 1213 مین سورت میں فیکٹری (تجارتی کوٹھی) کھولنے کی اجازت ملی۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مغل بادشاہوں سے مختلف مراعات حاصل کر لئے اور احمد آباد، بھڑوچ، آگرہ، لکھنو، مسولی، پھٹم، ہگلی، قاسم بازار، پٹنہ، اور مدراس میں انکی فیکٹریاں کھل گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے تحفظ اور فروغ کے لئے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ضروری سمجھا چنانچہ انہوں نے بزورِ طاقت تجارت کرنے کی ٹھانی اور مدراس کے گورنر کو خط لکھا کہ ایسی سول اور فوجی حکومت قائم کی جائے اور دونوں شعبوں کی کفالت کے لئے اتنی آمدنی کا بندوبست کیا جائے جو ہندوستان میں ایک وسیع اور پائیدار برطانوی مقبوضے کی بنیاد بن سکے۔ اس بیرونی اقتدار نے یوں تو مقبوضہ علاقوں کی معاشرتی زندگی کے سب ہی شعبوں پر اثر ڈالا لیکن روایتی تہذیب وتمدن کے تین عناصر خاص طور پر متاثر ہوئے۔ پہلا تعلیمی نظام، دوسرا عدالتی نظام اور تیسرا فکری واعتقادی نظام۔ پھر اکبر کے عہد میں جہاں اور بہت سی اصلاحیں ہوئیں وہاں پرانے تعلیمی نظام کے پہلو بہ پہلو سیکولر تعلیم کو رواج دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ ایسی درسگاہیں قائم ہوئیں جن میں طالب علموں کو ریاضی، اخلاقیات، زراعت، جیومیٹری، نجومیات، اصولِ حکومت، طبعیات، منطق، کیمسٹری، اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایسے اسکول کھولے گئے جن میں ہندو اور مسلمان لڑکوں کو ایک ساتھ فارسی میں تعلیم دی جاتی تھی، مضامین خالص سیکولر ہوتے تھے۔ مثلاً منطق، اخلاقیات، جیومیٹری، طبعیات، سیاسیات، تاریخ اور فارسی ادب۔ مگر سیکولر تعلیم کی پالیسی کو اکبر کے جانشینوں نے ترک کر دیا اور روایتی تعلیم پھر سے رائج ہوگئی۔ البتہ اورنگزیب کو مروجہ نصاب تعلیم کی فرسودگی کا احساس تھا (لطف یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اب تک اس قسم کا فرسودہ نظام رائج ہے) اسلامی فکر میں جمود کا بنیادی سبب تو یہ تھا کہ خود مسلم معاشرہ جمود کا شکار ہوگیا تھا۔ تلاش وتحقیق، تجربہ ومشاہدہ، اجتہادی تفکر اور نامعلوم کو معلوم کرنے کی پرانی روایت کو علمائے دین نے نہ صرف ترک کر دیا بلکہ وہ قرونِ وسطیٰ کے روشن خیال مسلمان مفکروں کو کافر، ملحد اور زندیق کے لقب سے نوازتے تھے اور انکی تصنیفات کا مطالعہ ممنوع کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اربابِ علم منقولات کی دلدل میں ایسے پھنسے کہ پھر کبھی نہ نکل سکے۔ بس مکھی پر مکھی مارتے ہیں، پرانی کتابوں کی شرحیں اور حاشیے لکھتے رہے بلکہ حاشیوں پر حاشیے۔ نہ اپنی بصیرت و آگاہی میں اضافہ کیا نہ بدنصیب قوم کی!

اخبار کو معاشرے کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کے سیاسی وسماجی شعور کی تشکیل میں اخبار بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فارسی میں پہلا اخبار 1822 میں شائع ہوا۔ فارسی کے پہلے اخبار ''مراۃ الاخبار'' کے مالک وایڈیٹر رام موہن رائے تھے۔ راجہ رام موہن رائے کو برطانوی اقتدار سے سخت نفرت تھی لیکن کلکتہ میں قیام کے دوران جب انہیں انگریزی قوانین اور طریقِ حکومت کے مطالعے کا موقع ملا تو انہوں نے محسوس کر لیا کہ غیر ملکی غلامی کا طوق انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی تحصیل کے بغیر گلے سے نہیں اتارا جا سکتا لہٰذا انہوں نے انگریزی زبان سیکھی وہ پندرہ برس تک کمپنی سے وابستہ رہے مگر 1815 میں پینشن لے لی اور سارا وقت سماجی کاموں میں صرف کرنے لگے۔ وہ ذات پات کی تفریق، بت پرستی اور ستی کے بے حد خلاف تھے چنانچہ ہندو مذہب میں اصلاح کی غرض سے انہوں نے برہمو سماج کی تنظیم قائم کی اور ہندو معاشرے میں جو برائیاں پیدا ہوگئیں تھیں انکے خلاف سخت مہم شروع کی۔ انہوں نے گورنر جنرل لارڈ ایمرسٹ کے روبرو جو محضر پیش کیا وہ ترقی پسند ہندوستانی حلقوں کی نئی زہنیت کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔ انہوں نے سنسکرت کالج کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ سنسکرت کالج کے طلباء وہی دو ہزار برس پرانی دقیانوسی باتیں سیکھیں گے جن میں رعونت آمیز اور کھوکھلی موشگافیوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اگر برطانوی پارلیمنٹ کی منشاء ہے کہ یہ ملک اندھیرے میں رہے تو سنسکرت نظامِ تعلیم سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا لیکن حکومت کا مقصد چونکہ دیسی آبادی کی اصلاح وترقی ہے لہٰذا ایسے کسی روشن خیال اور آزاد نظامِ تعلیم کو فروغ دینا زیادہ مناسب ہوگا جس میں ریاضی، نیچرل فلسفہ، کیمسٹری، علم الابدان اور دوسری مفید سائنسیں پڑھائی جائیں۔ دہلی کالج ابتدا میں روایتی طرز کا ایک مدرسہ تھا جسے 1825 میں کمپنی کی تعلیمی کمیٹی کی ہدایت پر مدرسے کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ دہلی کالج خالص سیکولر درسگاہ تھی وہاں ہندو، مسلمان وعیسائی سب کے لئے نصاب ایک ہی تھا۔ کالج کہ معلم متعلم کسی کی دینی عقائد سے کوئی سروکار نہ تھا۔ نہ کسی مذہب کی طرفداری کی جاتی تھی اور نہ کسی کی دل آزاری کی جاتی تھی۔ انگریزی شعبہ میں تو ظاہر ہے کہ انگریزی زبان وادب اور مغربی علوم ہی پڑھائے جاتے تھے مگر مشرقی شعبہ میں بھی روایتی نصاب کے علاوہ اصولِ حکومت و وضع قوانین، ضابطہ دیوانی، الجبرا، ہیئت، ریاضیات، پیمائش،

حرکیات، میلنکس، سکونیات، کیمسٹری، طبعیات، مساوات، اقلیدس، علم المناظر، اخلاقی سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور نیچرل فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سرکاری درسگاہوں میں تعلیم کو سیکولر کر دینے کی پالیسی کو ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے روشن خیال حلقوں نے سراہا۔ مگر کمپنی کی سیکولر پالیسی مخلصانہ نہ تھی بلکہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی تھی۔ چنانچہ لارڈ میکالے کی تنبیہ کے باوجود کمپنی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی برابر حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ انگریز حکام مشن والوں کی مالی امداد کرتے، انکو اپنی کوٹھیوں میں واعظ کے لیے بلاتے اور اپنے ملازموں کو پادریوں کی تقریر سننے پر مجبور کرتے تھے۔ 1857 کے بعد ہندوستان اگرچہ برائے راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگین ہوگیا مگر حکومت ہند کی مشن نواز پالیسیوں میں فرق نہ آیا البتہ ملک کے قوانین وضابطوں کو سیکولر پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ 1864 میں دیوانی عدالتوں سے مسلمان قاضی اور ہندو پنڈتوں کی چھٹی ہوگئی اور ہندو مسلم سول قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کا فرائض سرکاری مجسٹریٹس کے سپرد کر دیا گیا۔ 1872 میں قانونِ شہادت نافذ ہوگیا۔ یہ تمام قوانین مغرب میں رائج سیکولر اصولوں کی روشنی میں تیار کئے گئے تھے۔ مگر انگریزوں نے ہندوستانی سیاست کو سیکولر خطوط پر ترقی کرنے کا کبھی موقع نہ دیا۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' انکی پالیسی کا سنگِ بنیاد بن گیا۔ برصغیر میں سیکولرازم کی نشونما میں رکاوٹ ڈالنے والی دراصل خود حکومت برطانیہ کی سیکولر دشمن سیاسی پالیسی تھی۔ برصغیر میں سیکولر خیالات اپنی نئی شکل میں ہر چند کہ جدید طرز کی صنعت و حرفت، مغربی انداز کے نظم ونسق اور مغربی علوم کی انگریزی زبان میں تعلیم کی وجہ سے پھیلے لیکن سیکولر خیالات یہاں پہلے بھی موجود تھے البتہ انکی نوعیت مختلف تھی کیونکہ معاشرتی حالات اور فکری تقاضے مختلف تھے۔ سیکولر فکر کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس طرزِ فکر کے ہدف معاشرے کے وہ عناصر تھے جو جبر واستبداد کی علامت بن گئے تھے اور انسان دشمنی، تعصب اور تنگ نظری کے اظہار میں وہی کردار ادا کرتے تھے جو قرونِ وسطی میں مغربی کلیسا کا تھا۔ چنانچہ دینی امور کو دنیاوی امور سے الگ کر کے دیکھنا چاہئے۔ دنیاوی معاملات کو دینی معاملات میں ملا لینا جنون ہے۔ کیونکہ دینی حکام کا نیچر دنیاوی حکام معاشرت سے بالکل مختلف ہے۔ امورِ معاشرت وتمدن جو روز بروز تبدیل ہوجاتے ہیں پس وہ داخلِ مذہبی نہیں ہوسکتے۔ برصغیر میں سیکولر سوچ کے مالک لوگوں کو قدامت پرست حلقوں کی جانب سے ملحد اور دجال لائقِ قتل کے فتوے جاری ہونے لگے اور ان حلقوں میں اسلام خطرے میں ہے کی دہائیاں دی جانے لگیں۔ اب اکثر کہا جاتا ہے کہ مغربی معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوگئیں اسکا زمہ دار سیکولرازم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اخلاقی وروحانی انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہاں کا سرمایہ داری نظام سیکولرازم سے غداری کر رہا ہے۔ اگر زوالِ مغرب کا باعث سیکولر خیالات ہوتے تو وہ اخلاقی وروحانی خرابیاں جن میں مغرب مبتلا ہے سوشلسٹ ملکوں اور عوامی جمہوریتوں میں بھی عام ہوتیں کیونکہ یہ معاشرے تو زیادہ ہی سیکولر ہیں۔ مگر کیا کسی نے سنا ہے کہ سوویت یونین یا چین ویتنام یا کیوبا وہنگری وغیرہ میں بھی مغرب کے سرمایہ دار ملکوں کی طرح نائٹ کلب اور جوئے خانے کھلے ہوتے ہیں یا عیاشی کے اڈے قائم ہیں یا عورتیں سڑکوں پر کھڑی اپنی جسموں کا سودا کرتی رہتی ہیں یا غنڈے بدمعاش چرس پی کر راہ گیروں کو لوٹتے مارتے ہیں، گولیاں چلاتے ہیں اور گھروں، دکانوں کو آگ لگاتے ہیں۔ یا کبھی کسی نے سنا کہ وہاں بھی بینکوں پر دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں اور رات کے وقت سنسان سڑکوں پر چلنا خطرناک ہے۔ کیا کبھی کسی نے سنا کہ سوشلسٹ ملکوں میں بھی جرائم پیشہ گروہ پولیس سے مل کر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ کیا سوشلسٹ ملکوں میں بھی لوگ زریعہ معاش کی بے یقینی کے باعث ضبطِ تولید پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیا وہاں بھی لاکھوں کروڑوں ہٹے کٹھے لوگ ذہنی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ کیا وہاں بھی کروڑوں بے روزگاروں کی محفوظ فوج جنگ کا ایندھن بننے کی خاطر تیار ہے۔ کیا ان ملکوں میں بھی ہر پانچویں ساتویں برس اقتصادی بحران آتا رہتا ہے اور مہنگائی اور افراطِ زر نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ ان سوالوں کا جواب لازماً نفی میں ہوگا۔ تو ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے مین حق بہ جانب ہونگے۔ اصل مجرم یعنی سرمایہ دارانہ نظام کی نشاندہی سے گریز کر کے سیکولرازم کو قصوروار ٹھہرانا حقیقت کے منافی ہے۔ جہاں تک خدا، الہام اور آخرت پر ایمان کا تعلق ہے تو عرض یہ ہے کہ سیکولرازم کا دائرہ فکر وعمل مذہبی عقائد سے متصادم نہیں بلکہ الگ ہے۔ سیکولرازم کو کسی فرد، جماعت یا معاشرے کے مذہبی عقائد سے کوئی سروکار نہیں۔ دینی امور اور دنیاوی امور کے تقاضے اور دائرہ کار الگ الگ ہیں لہٰذا نہ ریاست کو اپنے باشندوں کے مذہبی عقائد میں مداخلت کرنی چاہیے اور نہ مذہب کو ریاستی امور میں دخل دینا چاہیے۔ بقول سبط حسن اس تصور کے پیش نظر فرد، ریاست اور مذہب کے مابین رشتوں کی تین جوڑیاں بنتی ہیں۔

۱۔فرداور مذہب ۲۔فرداور ریاست ۳۔مذہب اور ریاست

۱۔فرداور مذہب: فرداور مذہب پر غور کرتے وقت بقیہ دونوں رشتوں کو نظر انداز کرنا پڑیگا۔ یہ رشتہ ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے ہزاروں برس پہلے موجود تھا اور آج بھی دنیا کے بعض گمنام گوشوں میں ایسے قبیلے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہے لیکن انکی زندگی میں ریاست کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہودی مذہب، دینِ مسیحی اور اسلام کی تاریخ بھی شاہد ہے کہ فرداور مذہب کا رشتہ ریاست سے منسلک نہیں ہے۔ شریعتِ موسوی اس وقت نازل ہوئی جب بنی اسرائیل صحرائے سینا میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کررہے تھے اور اسرائیلی ریاستوں کا نام ونشان نہ تھا۔ گوتم بدھ نے چھٹی صدی قبل مسیح میں بدھ مت کا پرچار شروع کیا لیکن پہلی بدھ ریاست تین سو سال بعد اشوکِ اعظم نے قائم کی۔ عیسائی مذہب کی تاریخ بھی یہی ہے چنانچہ پہلی عیسائی ریاست حضرت مسیح کے تین سو سال بعد فلسطین سے سینکڑوں میل دور قسطنطنیہ میں قائم ہوئی۔ خود اسلام کا ظہور کسی ریاست کا مرہونِ منت نہیں بلکہ مکہ میں تو آنحضرت ﷺ نے اسلام کا اعلان فرمایا، وہاں غیر مسلموں کا راج تھا۔

۲۔فرداور ریاست: فرداور ریاست کے رشتے پر غور کرتے وقت ہمیں تیسرے عنصر یعنی مذہب کو نظر انداز کرنا پڑیگا۔ ریاست میں فرد کی حیثیت شہری کی ہوتی ہے اور اسکے شہری حقوق مذہبی عقائد سے متعین نہیں ہوتے۔ ریاست کی نظر میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی شہری ہونے کی حیثیت سے برابر ہوتے ہیں۔ ریاست کسی ایک مذہب کے شہری کو دوسرے مذہب کے شہری پر فقط مذہب کی بنا پر ترجیح نہیں دے سکتی نہ ایسے قوانین وضع کرسکتی ہے جس سے ایک مذہب والوں کو فائدہ اور دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

۳۔ریاست اور مذہب: ریاست اور مذہب میں جتنا قریبی تعلق ہوگا فرد کی مذہبی اور شہری آزادیاں اسی نسبت سے متاثر ہونگی۔ اسکے برعکس مذہب ریاست سے جتنا دور ہوگا مذہب اور ریاست دونوں کو آزادی سے ترقی کرنے کے اتنے ہی زیادہ موقع ملیں گے۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ سیکولرازم کے نزدیک دنیاوی خوشحالی انسانی مسرت کا اہم زریعہ ہے۔ ہم اقراری مجرم بن کر بہ خوشی تسلیم کرتے ہیں مگر مجرموں کے کٹہرے میں ہم اکیلے نہیں ہونگے بلکہ کروڑوں فاقہ کش مسلمان ہمارے ساتھ ہونگے۔ وہ سب لوگ جن کی دلی آرزو ہے کہ دنیا میں آرام اور عزت وآبرو کی زندگی بسر کریں مگر جنکے شب وروز روٹی، روزگار کی تلاش میں گزرتے ہیں، جن کے بچے تعلیم سے محروم ہیں اور جن کے پاس نہ سر چھپانے کی جگہ ہے نہ دوا وعلاج کے لیے دام ہیں۔ ہماری صفوں میں وہ بزرگ ہستیاں بھی ہوں گی جنہوں نے اپنی زندگی مسلمانوں کی دنیاوی حالت درست کرنے کی کوششوں میں گزار دیں۔ اگر دنیاوی زندگی کی مسرت وشادمانی مقصود نہ ہوتی تو آزادی کی کیا ضرورت تھی؟

ورنہ الجزائر، لیبیا، شام، یمن، ایران اور انڈونیشیا کبھی آزاد نہ ہوتے۔ قومی حقِ خود ارادیت مغرب کا خالص سیکولر نظریہ ہے۔ جو وہاں اٹھارویں صدی میں قومی ریاستوں کے وجود کے دوران وضع ہوا۔ اسی نظریے کے مطابق اٹلی، یونان، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بیلجیئم اور امریکہ غرضیکہ بے شمار مغربی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اسی نظریے کے مطابق پہلی جنگِ عظیم کے بعد مجلس اقوام نے یورپ میں ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی نئی ریاستیں قائم کیں۔ اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ میں درجنوں قومی ریاستیں بنیں۔

''اب اگرچہ سیکولرازم اور سوشلزم کے اقتصادی نظریات میں بہت بڑا فرق ہے لیکن اسکے باوجود اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جدید سیکولرازم اور سوشلزم دونوں صنعتی نظام کے بطن سے نکلے ہیں اور دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں مثلاً سائنسی اندازِ فکر اور سائنسی طرزِ تعلیم پر اصرار، جاگیری نظام کی مخالفت اور صنعتی نظام کی حمایت، جمہوری حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ کا غیر مابعد الطبعیاتی تصور، شہری حقوق کا احترام، آزادیِ فکر اور ریاست ومذہب کی خودمختاری وغیرہ۔

اگر آپ کو انقلابی تبلیغ کیلئے عام جلسہ کرنے کی اجازت نہیں ملتی اگر آپ کو عام میٹنگ بلانے کی اجازت نہیں ہے تو یہ کام ہوٹلوں، گھروں، ٹرینوں، بسوں، کارخانوں اور مختلف پبلک مقامات پر کیجئے۔

﴿﴿نیلسن منڈیلا﴾﴾

آئیڈیالوجی

ریمنڈ ولیمز

انگریزی میں لفظ آئیڈیالوجی پہلی دفعہ تعقلی فلسفی Destutt de Tracy. Taylor نے سال 1796 میں متعارف کرایا۔ یہ فرانسیسی لفظ ideologie کا ترجمہ تھا۔ٹریسی نے ایک مقالہ پڑھا اور یہ تجویز دی کہ 'خیال، ذہن کے فلسفے، یعنی خیالات کی سائنس کو آئیڈیالوجی کا نام دیا جائے تا کہ اسے قدیم مابعدالطبعیات سے ممیّز کیا جا سکے۔اس سائنسی مفہوم میں آئیڈیالوجی کو نظریہ علم اور لسانیات میں 1819 تک استعمال کیا جاتا رہا۔

اس لفظ کے جدید معنوں کو نپولین بوناپارٹ نے شہرت دی۔ اس کے خیال میں جمہوریت کے حامی لوگوں کو حاکمیت تک بلند کرتے تھے، جبکہ لوگ اسے عملی شکل دینے کے لئے نا اہل تھے۔ اس طرح نپولین نے دور روشن خیالی کے اس نظریے کو 'آئیڈیالوجی' کا نام دیا۔ وہ کہتا ہے:

''یہ نظریہ سازوں کا ڈھکوسلہ ہے_ یہ گڈمڈ مابعدالطبعیات_ جس کی وجہ سے ہمارے پیارے وطن فرانس پر تمام مصائب وآلام پڑے ہیں۔ اور جو اس لئے اختراع کی گئی ہے تا کہ بنیادی وجوہات تلاش کی جا سکیں اور اس بنیاد پر قوموں کی قانون سازی استوار ہو، بجائے اس کے کہ قوانین کو انسانی قلب اور تاریخ کے سبق کے مطابق ڈھالا جائے۔''

اس معنی کی گونج پوری انیسویں صدی میں سنائی دیتی رہی۔ کسی بھی سماجی پالیسی پر تنقید جو جزوی یا کلی طور پر کسی سماجی نظریے سے اخذ کی گئی ہو اس پر کی جانے والی رجعت پسندانہ تنقید میں یہ عنصر ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ جمہوری اور سوشلسٹ پالیسیوں پر تنقید میں یہ عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔ یقینی بات ہے کہ جب سے نپولین نے ان معنوں میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے، انیسویں صدی کے بعد سے نظریاتی آدمی (آئیڈیالوجی والے فرد) کو انقلابی گردانا گیا۔ نپولین کی مخاصمانہ تنقید کے بعد، ان تینوں الفاظ، ideology, ideologist and ideological کے معنی میں وسعت آ گئی جس کی رو سے اب ان میں ایک طرح کا تجریدی، ناقابل عمل اور کٹر پن کا معنی حاوی ہو گیا۔ اس سلسلے میں Scott کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے، (Napoleon, vi, 251): وہ لکھتا ہے: آئیڈیالوجی وہ اسم صفت تھا جس کے ذریعے فرانسیسی حکمران ہر اس قسم کے نظریے کو ممیّز کرتے تھے جو اگر ذاتی مفادات پر منحصر نہ بھی ہو، سوائے گرم دماغ لڑکوں، یا خبطی قسم کے جذباتی لوگوں میں ہی پسندیدہ ہو سکتا تھا، (1827)۔ کارلائل اس مفہوم سے آگاہ تھا۔ اس نے اس مفہوم کی تنسیخ کی کوشش کی۔ وہ کہتا ہے'' کیا برطانوی قاری ...ہمارے اس ناخوشگوار نظریے کو آئیڈیالوجی کہتا ہے؟ *(Chartism, vi, 148; 1839)*

انیسویں صدی کے آخر تک، رجعت پسند مفکرین نے لفظ آئیڈیالوجی کو جس تحقیرانہ انداز سے استعمال کیا، اور جس معروف انداز میں مارکس اور اینگلز نے اسے ''جرمن آئیڈیالوجی'' *(1845-7)* میں استعمال کیا، اور پھر جیسا کہ اس کا استعمال عام چلن میں رہا، ان سب میں براہ راست تسلسل نظر آتا ہے۔ سکاٹ نے اس کے خدوخال متعین کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد ایسا نظریہ ہے جو ''کسی طرح بھی ذاتی مفادات پر مبنی ہو۔'' اگرچہ نپولین کا متبادل تھا ''قلبِ انسانی کا علم اور تاریخ کے سبق''۔

مارکس اور اینگلز نے اپنے اپنے ریڈیکل جرمن ہم عصروں کی سوچ پر تنقید کرتے ہوئے تاریخ کے حقیقی عمل سے نظریات اخذ کرنے، یعنی ان معنوں میں تجرید پر توجہ دی۔ انہوں نے خاص طور پر کہا کہ خیالات، خیال طور پر کسی دور کے حاوی نظریات ''سوائے برتر مادی تعلقات کے خیالی اظہار کے کچھ نہیں، یعنی یہ وہ برتر مادی تعلقات ہیں جنہیں خیالات کی شکل میں جانا گیا ہے۔'' (جرمن آئیڈیالوجی) اس طرح سے پیدا شدہ آئیڈیالوجی کو جاننے میں ناکامی سے مراد حقیقی کو الٹی صورت میں جاننا ہے۔ اگر تمام آئیڈیالوجی میں انسان اور ان کے حالات الٹی صورت میں نظر آتے ہیں جیسا کہ کیمرہ کے نیگیٹو میں، تو یہ صورت صرف ان کے تاریخی عمل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس طرح آنکھ کی پتلی پر زندگی کی چیزیں الٹا عکس ڈالتی ہیں۔ *(German Ideology, 47)*

بعدازاں اسی نظریے کو اینگلز نے یوں بیان کیا:

ہر آئیڈیالوجی..... جب یہ موجود مادی نظریے کی اساس پر ابھر آئے تو اس مادی [بنیاد] کو اور آگے لے کر جاتی ہے، وگرنہ یہ آئیڈیالوجی ختم ہو جاتی ہے، مطلب یہ کہ خیالات سے دلچسپی گویا وہ آزاد وجود رکھتے ہوں، ان کا ارتقا آزادانہ ہو اور خود اپنے قوانین کے تحت ہوں۔ یہ کہ ان لوگوں جن کے اذہان میں سوچ کا یہ عمل جاری ہوتا ہے وہ اس امر سے لازمی طور پر بے خبر رہتے ہیں کہ ان کی مادی زندگی کی صورتِ احوال ہی ہیں جو اس عمل کی تعیین کر رہی ہیں، وگرنہ تمام آئیڈیالوجی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (Feuerbach, 65-6)

وہ مزید کہتا ہے:

''آئیڈیالوجی وہ عمل ہے جسے نام نہاد مفکر شعوری طور پر سرانجام دیتا ہے لیکن ایک غلط شعور کے ساتھ۔ وہ اصل مقاصد سے بے خبر ہی رہتا ہے وگرنہ یہ شعور کا عمل ہرگز نہ رہے گا۔ لہٰذا وہ ظاہری یا غلط مقاصد کا تصور کرتا ہے۔ چونکہ یہ سوچ کا عمل ہے اس لئے وہ اس کی بہتر اور اس کا مافیہا نری سوچ pure thought سے اخذ کرتا ہے جو خود

اس کی یا اس کے پیشرو کی ہوتی ہے۔

اس طرح آئیڈیالوجی اس لحاظ سے تجریدی اور غلط سوچ ہے کہ یہ ابتدائی رجعت پسندانہ استعمال سے جڑی ہوئی ہے لیکن متبادل، یعنی مادی صورتِ احوال اور تعلقات، کا غلط بیان۔ مارکس اور اینگلز نے اس نظریے کو مختلف طریقے سے استعمال کیا۔ حکمران طبقے کے 'مفکرین'' اس کے فعال نظریہ ساز تھے جو خود اس طبقے کے اپنے آپ کے بارے واہموں کو اپنی روزی روٹی کا وسیلہ بناتے ہیں (German Ideology, 65)۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''فرانسیسی جمہوریت کے نمائندے رپبلیکن آئیڈیالوجی میں اس حد تک دھنسے ہوئے تھے کہ کچھ ہفتوں کے بعد ہی انہیں جون کی لڑائی کی اہمیت کا احساس ہو سکا۔'' (فرانس میں خانہ جنگی) ان کی تحریروں میں آئیڈیالوجی کا یہ مفہوم واضح نظر آتا ہے کہ یہ واہمہ، غلط شعور، حقیقت کا فقدان، حقیقت کا الٹا ہو جانا ہے۔ اینگلز کا خیال تھا کہ ''اعلیٰ درجے کی آئیدیالوجی''، جیسا کہ فلسفہ اور مذہب، مادی دلچسپیوں سے اور زیادہ دور ہوتی ہیں بہ نسبت سیاست اور قانون کی بلا واسطہ آئیڈیالوجیز سے، لیکن تعلق اگرچہ پیچیدہ ہے، پھر بھی فیصلہ کن۔ (Feuerbach, 277) آئیڈیالوجی کی ایسی اشکال بھی ہیں جو اور بھی زیادہ ہوا میں پرواز کرتی ہیں، جیسا کہ فطرت کے بارے، خود انسان کے اپنے بارے، روحوں کے بارے، جادوئی قوتوں کے بارے نظریات۔ (Letter to Schmidt, 1890)

مارکس کی کچھ تحریروں میں آئیڈیالوجی کا ایک غیر جانبدارانہ مفہوم بھی ملتا ہے۔ یہ خاص طور پر اس کی کتاب 'سیاسی معاشیات پر تنقید میں حصہ'' میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

ضروری ہے کہ پیداوار کی معاشی شرائط کی مادی تبدیلیوں اور قانونی، سیاسی، جمالیاتی، فلسفیانہ، مختصراً نظری بنتروں میں فرق جس میں انسان اس مخاصمت سے آگاہی حاصل کرتے ہیں اور پھر اس میں جدوجہد کرتے ہیں۔*

یہ پہلے ذکر کئے گئے مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ نظری بنتریں پیداوار کی شرائط میں تبدیلیوں کا اظہار ہیں۔ لیکن انہیں اس طرح دیکھا گیا ہے کہ یہ وہ بنتریں ہیں جن میں انسان ان تضادات سے آگاہ ہوتے ہیں جو معاشی پیداوار کی صورتوں میں تبدیلی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ مطلب اس مفہوم سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہوتا جس میں آئیڈیالوجی فقط ایک واہمہ ہے۔ درحقیقت آئیڈیالوجی کا یہ مفہوم کہ اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو مخصوص مادی مفادات سے، یا زیادہ وسیع معنوں میں، کسی مخصوص طبقے یا گروہ کے حوالے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، اتنا ہی مستعمل ہے جتنا اس لفظ کا یہ معنی کہ اس سے مراد واہمہ ہے، خام خیالی ہے۔ مزید براں، مارکسی روایت میں یہ تمام مفہوم استعمال تو ہوئے ہیں، لیکن واضح طور پر نہیں۔ لیکن لینن سے اس اقتباس کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں واہمے یا غلط شعور کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا:

''سوشلزم، جہاں تک یہ پرولتاریہ کی جدوجہد کی آئیڈیالوجی ہے، اپنے آغاز، ارتقا اور استحکام کے ادوار سے گزرتی ہے، بالفاظِ دیگر، یہ تمام انسانی علم کے مواد پر بنیاد رکھتی ہے، اس کے پیشِ نظر سائنس کا اعلیٰ درجہ ہوتا ہے، اور یہ سائنسی کام کا تقاضا کرتی ہے۔..... پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد میں جو اپنے آپ سرمایہ دارانہ تعلقات سے ابتدائی طور پر جنم لیتی ہے، اس میں سوشلزم بطور نظریہ ساز متعارف کرواتے ہیں۔ (Letter to the Federation of the North)

لہٰذا 'نئی پرولتاری آئیڈیالوجی' ظہور پذیر ہوتی ہے، اور ہر صورت میں آئیڈیالوجی خیالات کا وہ سسٹم ہے جو اس سے متعلقہ طبقے کے لئے موزوں ہے۔ ایک آئیڈیالوجی کو کسی دوسری کے برخلاف درست اور ترقی پسندانہ کہا جا سکتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسری آئیڈیالوجی، جو طبقاتی طور پر مخاصمانہ ہے، اگرچہ اس طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے لیکن وہ عمومی انسانی مفادات کی مخالفت میں ہے۔ اس طرح پہلے بیان کیا گیا آئیڈیالوجی کا مفہوم جس میں غلط شعور کا عنصر نمایاں ہے، ان خیالات سے منسلک کیا جا سکتا ہے جن میں طبقاتی مفادات کا خاصہ موجود ہو۔ لیکن آئیڈیالوجی کا یہ غیر جانبدارانہ مفہوم اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کے لئے اس کے ساتھ ایسا اسم صفت لگا تا جائے جو اس طبقے یا سماجی گروہ کی تشریح کرے جس سے وہ منسلک ہے۔ یہ استعمال کئی اقسام کے دلائل میں مشترک ہے۔ ساتھ ہی، مارکسزم کے ساتھ دوسرے نظریات میں بھی، آئیڈیالوجی اور سائنس (نظریات بطور مربوط علم) میں فرق واضح فرق روا رکھا جاتا ہے تاکہ محض واہمے اور تجریدی سوچ کو ممیّز کیا جا سکے۔ اس سے اینگلز نے آئیڈیالوجی کی بابت جو امتیاز قائم کیا، اسے مزید تقویت ملتی ہے کہ جب انسان اپنی زندگی کی حقیقی شرائط کو پا لیں گے اور اس بنا پر اصلی مقاصد کا حصول ممکن ہوگا، تو اس کے بعد ان کا شعور صحیح معنوں میں سائنسی ہو جائے گا کیونکہ اب ان کا حقیقت سے تعلق قائم ہو چکا ہوگا۔ مارکسزم بطور سائنس اور دوسرے سماجی نظریات میں جنہیں بطور آئیڈیالوجی لیا جاتا ہے، امتیاز کی یہ کوشش بحث مباحثے کو جنم دیتی ہے۔ سماجی علوم میں آئیڈیالوجی بطور تصوراتی سسٹم کے اور بطور سائنس کے یہ فرق قائم کرنا عام سی بات ہے۔

اسی اثنا میں آئیڈیالوجی کو نپولین کے ذریعے دیا گیا معنی اور مفہوم اب بھی عام ہے۔ سمجھدار لوگ تجربے پر یقین رکھتے ہیں، یا ان کا کوئی فلسفہ ہوتا ہے۔ احمق لوگ آئیڈیالوجی پر انحصار کرتے ہیں۔ ان معنوں میں، یعنی جیسا کہ اس لفظ کا استعمال نپولین نے کیا، یہ اصطلاح برے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔

*Marx's German reads: ... kurz, ideologischen Formen, worin sich die Menschen diesen Konflikts bewusst werden ...

SOURCE: Williams, Raymond. Keywords: A Vocabulary of Culture and Society. Revised edition. New York: Oxford University Press, 1985. Pp. 153-157.

اختر مینگل ! سا مراج کا اگلا مھرہ

زرمینہ گل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بی این پی کے لئے بلوچ نیشنلزم کے دھارے میں واپس آ نے یا بلوچستان میں سیاسی قوت حاصل کرنے کی پرانی مجنونانہ دوڑ ختم ہوچکی ہے اور مینگل صاحبان نے مفادات وقت کی بہتر مناسبت اور عمومیت سے پی پی پی حکومت اور ریاست کی حمایت کرنا بہتر سمجھا ہے۔اس طرح یہاں قومی سیاست میں قوم پرستی کا دروازہ اختر مینگل کیلئے بند ہو چکا ہے۔میں جانتی ہوں اور اس حقیقت سے پوری طرح آ گاہ ہوں کہ سردار مینگل اور ان کے مشیر میری اس بات کا، جسے وہ اپنے پر الزام تصور کریں گے،شدت سے انکار کریں گے اور اس امر پر اصرار کریں گے کہ سردار نے اقتدار میں آنے کیلئے کبھی سامراج سرپرستی کی خواہش ظاہر نہیں کی۔کاش ایسا ہو! لیکن حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں ۔جس طرح سردار اختر مینگل نے شہداء مرگاپ (اول) کے تعزیت میں جانے کے بعد تربت میں جلسے کے دوران آزاد بلوچستان کا جھنڈا بلند کرنے کی نہ صرف مذمت کی بلکہ بی این پی کے چار کارکنوں کو پارٹی کی بنیادی رکنیت سے ہی معطل کر دیا۔یہ اقدام کس طرف اشارہ کرتے ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ اختر مینگل کے بعض مشیروں اور پارٹی قائدین میں اچھے خاصے لوگ دل ہی دل میں سردار مینگل کے اس سیاسی رویے کو ناپسند کر رہے ہونگے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی سردار مینگل کی جانب سے پاکستان پرستی اور پاکستانی سامراج کے آ شیر باد کی خواہش پر بہت افسوس ہوا ہے۔

پاکستانی سامراج اور آ ئی ایس آ ئی ہزاروں بلوچوں کے ساتھ ساتھ خود اختر مینگل کے بھائی شہید اسد مینگل کے قتل کا بھی مرتکب ٹھہرے ہیں۔جیسا کہ بڑے سردار عطاء اللہ مینگل نے خود بھی اپنی پارٹی کو اس زمانے میں موثر بنانے کیلئے پاکستانی فوج اور ریاست پر الزام عائد کیا تھا۔

1982 کو لندن میں خان عبدالولی خان کو بھیجے گئے اپنے طویل خط کے چند سطور میں انہوں نے (بڑے سردار نے) موقف اختیار کیا تھا کہ ''مجھے آزادی کی قسم ہے کہ جس ملک کو پاکستان کہا جا رہا ہے، وہ عظیم تر پنجاب کے سوا کچھ نہیں ہے، اور اس بات کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلم لیگ سے لے کر پاکستان تک کے بنانے میں انگریز نے سب سے زیادہ کام کیا۔انگریز کو جنوبی ایشیاء میں اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے ایک متحد، آزاد اور مضبوط ہندوستان کی جگہ ایک کمزور اور محتاج ہندوستان بھاتا تھا۔اس لئے ایک ایسے ملک کا وجود میں لانا ضروری تھا جو ہندوستان کی ترقی کی راہ میں مستقل رکاوٹ اور اس کی آزادی کیلئے دائمی خطرہ بنا رہے، جس کے لئے مذہبی جذبات کے استعمال سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔اس لئے انگریزوں نے DIRTY TRICK کیلئے مذہب کو سب سے آسان اور پائیدار ذریعہ سمجھا اور اسی کو منتخب کیا۔چنانچہ مذہب کو بنیاد بنا کر اسے ہندستان کی تقسیم کا ذریعہ بنایا گیا۔جو ملک سامراجی مفادات کیلئے بنایا گیا ہو، جس کے تخیل کو جنم دینے والے خود برطانوی سامراج ہوں، جس کی جدوجہد کے علمبردار چند سازشی بیوروکریٹ ہوں، جس کے قیام کی بنیاد سازش پر کی گئی ہو اور جس کے بنانے اور قائم رکھنے کیلئے نسل کشی بنیادی شرط ہو، اس ملک میں بسنے والے انسانی اقدار، جمہوری حقوق اور بھائی چارے کے تصور سے کس حد تک آشنا ہوسکتے ہیں۔۔؟؟

لہٰذا اس صورتحال میں 1973 کے آئین کی آڑ لے کر سندھ، بلوچستان اور سرحد کو پنجاب کی منکوحہ بیوی تصور کرنا کہاں کی منطق ہے۔عظیم تر پنجاب کے ساتھ اب ہم لوگوں کا گزارہ ممکن نہیں۔کیا اس سے بھی زیادہ تلخ تجربے درکار ہیں۔سندھ بلوچستان میں جس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور جس تیزی سے مقامی آبادی کو اقلیت میں بدلنے کی کاروائیاں کی جارہی ہیں اس نے ہمارے لئے صرف دو ہی راستے کھلے چھوڑے ہیں۔یا تو ہم اپنے قومی تشخص سے دستبردار ہوجائیں یا پھر آزادی اور موت کو شرط اور شعار بنا کر عظیم تر پنجاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں۔میرے نزدیک ہمارے تمام پرانے ساتھی جو دل سے یا اپنے کسی عمل سے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ 1973 کے آئین کی بحالی اور انتخابات ان کے مستقبل کی

ضمانت دیتے ہیں، وہ ایک ایسے قومی جرم کا ارتقاب کر رہے ہیں، جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی''۔

یہی وجہ ہے کہ میں اختر مینگل کو چاہنے والے اور اس کے پیچھے چلنے والے لوگوں اور اختر مینگل اور ان کے چند دوستوں کے درمیان امتیاز محسوس کر رہی ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ جب اختر مینگل پاکستان آئے تو انہوں نے التزاماً پاکستان نواز باتیں کی ہیں۔ پاکستانی پالیسیوں کو ہمیشہ کبھی کھلے بندوں کبھی ڈھکے چھپے انداز میں سراہا ہے اور مختلف طریقوں سے پاکستان دشمن پالیسیوں پر اصرار کرنے کی بنا پر بی این پی کے عام کارکن کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور پاکستان سامراج کے خلاف نعرے لگانے پر اسے ڈانٹ دیا گیا ہے۔ تب سے عام کارکن سردار صاحب سے خوش نہیں ہے۔ سردار مینگل کی جانب سے یہاں پاکستانی سیاست اور حکمت عملی کیلئے بی این پی اور اپنے آپ کو اتحادی ثابت کرنے پر زور دینے کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ یہ سب اقدام اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ مینگل صاحب اپنے آپ کو پاکستان کیلئے ایک اہم مہرے کے طور پر پیش کرنے کا جتن کر رہے ہیں۔

بی این پی اور این پی کی موجودہ پالیسیوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں کی پالیسیوں میں پارلیمانی سیاست کے حوالے سے ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے زریعے سے ایک ہی طبقے کو دونوں خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یعنی NP اور BNP دونوں پاکستانی قابض ریاست کو خوش اور مطمئن کرنے کی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں شامل ہیں۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ سردار اختر مینگل نے شہید بگٹی اور شہدائے مرگاپ کے وقت بڑی بے دلی اور سرد مہری سے کام لیا، گو آغا حسن کہتے ہیں کہ مینگل صاحبان نے ان واقعات پر سب سے پہلے مذمت کی لیکن وہ اتنے بھولے تو نہیں کہ یہ بھی فرق معلوم نہ ہو کہ کسی مسئلے کی مذمت کرنا اور اس کو ایشو بنانا دو مختلف اقدام ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کہ انہوں نے اس اہمیت کے قومی ایشو کو صرف ایک مذمتی بیان پر ہی ٹال دیا۔ اس موقع پر ایک پاکستانی جرنیل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں تو خدشہ تھا کہ بلوچستان میں اس مسئلے پر دیگر قوم پرست قوتوں کی طرح مینگل گروپ بھی طوفان بر پا کر دے گی لیکن یہ تو ہمارے دست بازو نکلے۔ یقیناً وہ اس مسئلے پر اسٹیٹ کو پریشان بھی کر سکتی تھی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ آخر کیوں؟

یہ ایک بڑا سوال ہے اور اس کا فقط ایک ہی جواب ہے کہ مینگل صاحب بی این پی کو ایک سامراج دشمن تحریک کا ہراول دستہ بنانے کیلئے تیار نہیں ہے۔ کیونکہ سامراج سے ان کی دوستی ہوگئی ہے۔ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ آج سامراج کے خلاف لڑائی اور جمہوریت کیلئے لڑائی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

اس سے قبل بظاہر بی این پی مینگل نے ایک حد تک توبہ کر لی تھی اور بلوچ قومی تحریک آزادی کو ناقابل تسخیر طاقت سمجھ کر کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا۔ اس سے اس نے درحقیقت اپنی طرف سے یہ یقین کر دیا تھا کہ اس توبہ تائب سے ایک طرف قومی جہدکار رحم کھا جائیں گے اور دوسری طرف عوام بی این پی کی محبوبیت سے متاثر ہو کر اس کے لئے نرم گوشہ رکھنے پر مجبور ہوگی۔ اب بی این پی نے اسٹیٹ کے ساتھ ملکر سیاست کی جو نئی بساط بچھائی ہے اور اس نے جو بھی چال چلی ہے وہ ہر چال گھوڑے کی چال ہے جو بیک وقت فرضی اور فعل کو زد میں لے سکتا ہے۔ یہ غریب اور تنگ دست لوگوں میں پیسہ بٹور کر ہمیشہ کی طرح ان کی عزت نفس مجروح کرنا چاہتے ہیں اور یہ پاکستانی سیاست کا ازلی فن ہے، اور اس فن کے شناور بڑے بڑے سرمایہ دار، جاگیردار اور زمیندار ہوتے ہیں یا سامراجی یونٹس سردار و نواب اور ڈرگ ڈیلرز۔ لوگوں کے عزت نفس کو ان پارلیمانی کیڑوں نے تج دیا ہے۔ ان کے ورثے کو لٹا دیا ہے۔ ان کے پاس جو متحرک کرنے والی طاقت (عوام) تھی وہ اب ان کے دم ہلانے کے پیچھے نہیں چلیں گے۔ اب با شعور عوام کو دھوکے میں لانے کیلئے ان لوگوں کے پاس کوئی MOTIVATING FORCE نہیں ہے۔

ہماری تحریر میں اختر مینگل پارلیمانی سیاست، اس کے طور طریقوں اور اسلوب پر خاصی تند و تیز تنقید ہے۔ بعض کا وہ جواب بھی دیتے ہیں مگر کاش وہ جواب سیاسی اور سائنسی ہوں! اکثر ریاستی دانشور و لکھاری حضرات جنہوں نے ایسے تحریروں پر قلم اٹھایا ہے وہ ایسے دانشور ہیں جو نجی محفلوں میں ان تحریروں و تجزیوں کے صداقت کی تعریف کرتے ہیں لیکن ریاستی خوشنودی کیلئے اپنے آقاؤں کو تراش کر بھیجتے ہیں۔

ہماری سیاست میں خوشامد کے یہ انداز اور منافقت کے رویے غوث بخش بزنجو کی دین ہیں ۔وگرنہ یہ انداز ہمارے سیاسی کلچر کے حصے نہ تھے۔ یہ دراصل بلوچستان پر پاکستانی قبضہ کے بعد پارلیمانی سیاسی کلچر کا منطقی نتیجہ ہیں ۔ان رویوں کی آبیاری بھٹو دور اور نام نہاد جمہوری دور نے بھی خوب کی ۔لیکن مجموعی طور پر خوشامد ،خوف اور دہشت کے جو انداز پاکستانی سامراج کے دور میں ہماری سیاسی زندگی میں در آئے وہ اس سے پہلے ہمارے ہاں اتنے واضح اور نمایا ں نہ تھے۔ چنانچہ آج بھی پارلیمانی سیاست کے اندر وہی انداز روا رکھے جارہے ہیں ۔اب ذرا غور کیجئے یہ ہمارے دانشور، وکیل حضرات بلوچ پارلیمانی سیاست اور ووٹ و الیکشن کیلئے دن رات ایک کرکے کس کے مقاصد کو SERVE کررہے ہیں؟

آج بھی لوگوں کو اٹھانے اور غائب کرنے کے بعد ان کی مسخ شدہ لاشیں پھینکنے کا سلسلہ اسی شدومد کے ساتھ جاری ہے۔اور نام نہاد پارلیمانی وزراء بھی اس قاتل اسٹیٹ اور اس کے آئین کے تحت ایک بار پھر حلف اٹھالیں گے ۔آج کے حالات 2008 کے حالات سے بدتر ہیں ۔تو لوگ یہ سوال اٹھانے پر حق بجانب ہوں گے کہ اُس وقت الیکشن میں بائیکاٹ کیوں کیا گیا؟ درحقیقت اُس وقت بھی انہی کے مفادات ،تضادات اور باہمی رسہ کشی کا معاملہ تھا، کوئی قومی ایجنڈا زیرغور نہیں تھا۔لیکن وہ اب پچھلے انتخابات کے بائیکاٹ کو تاریخی غلطی قرار دے کر اس بار ریاستی انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کی تیاریوں میں مصروف عمل ہیں ۔تو ان چار پانچ سالوں میں حالات کہیں سے کہیں جا پہنچے ہیں ۔اور سماجی تضادات کھل کر سامنے آ گئے ہیں ۔ریاست کی بچھائی ہوئی شطرنج بے معنی لگتی ہیں اور پورا ریاستی وجود اور اس کی رٹ بلوچستان میں ڈنواں ڈول ہوتا دکھائی دیتا ہے۔لیکن اقتدار میں آنے کا نشہ اور اس کیلئے بے تابی اُوپری طبقے کی قیادت کو یک رُخا بنا دیتی ہے۔ یہ سیاست انہیں دائیں بائیں تک بھی دیکھنے نہیں دیتی اور نہ سوچنے دیتی ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستانی سیاست کو فوج کی حکمرانی نے بالآخر ایک بند گلی BLIND ALLEY میں پھنسا دیا ہے اور ہمارے نام نہاد قوم پرستوں کیلئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی صورتحال پیدا کردی ہے۔کیونکہ سیاست ہی نہیں کوئی بھی کام ہوا گر ہوم ورک نہ کیا جائے تو پھر فتح سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں رہتا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی بدبختی یہی ہے جن کا واسطہ آن پڑا ہے، پاکستانی معاشرے کی سب سے منظّم سرکش طاقت سے ۔اور یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ غیر منظّم، غیر مستحکم اور پسماندہ نوآبادیاتی سماج میں سب سے زیادہ منظّم طاقت فوج ہی ہوتی ہے۔

اب پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں بلکہ عامتہ الناس بھی BNP اور اس کے منشور و عزائم سے کافی عرصہ پہلے واقف ہونے لگے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ (شریک اقتدار) قومی غداری کی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی ۔ دراصل نوآبادیاتی معاشروں میں جہاں ایک قلیل اقلیت کی حکمرانی ہوتی ہے، اس کے پاس حکمرانی کے سب سے اہم ہتھیار دو ہی ہوتے ہیں۔

اول: معاشرے کے قدرے بااثر طبقے کو مراعات دے کر اپنے ساتھ رکھنا۔

دوم: رعب اور دبدبہ، وحشت اور تشدد کا قدم قدم پر اظہار کرنا تاکہ عوام خوفزدہ رہیں اور سیاست سے اجتناب برتنے لگیں۔

"2013 بھی رد انقلابی قوتوں کے پارلیمانی سیاست میں منتخب ہونے کا سال ہوگا اور ان کی یہ انتخابات خون خرابے کا نہ ختم ہونے والا نیا سلسلہ اپنے ساتھ لائے گا"۔

اگر انسان کے اندر سے نیند ختم ہو جائے تو پھر آپ کے شعور، ادراک اور بصیرت کا معیار اس قدر زیادہ تبدیل ہو جاتا ہے کہ اس ضمن میں مزید پیش رفت کی جاسکتی ہے۔

((((اوشو))))

اسلام اور پاکستان

شیہک بلوچ

اسلام ایک مقدس دین ہے جس میں کسی قسم کی ذاتی مفاد اور لالچ نہیں ہے۔ اسلام کو اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر کے ذریعے زمیں پر بھیجا اور فرمایا کہ جاؤ اور ان گمراہ لوگوں تک میرا پیغام پہنچا دو جو کہ مختلف قسم کے برائیوں اور قتل و غارت میں مبتلا ہیں تا کہ دنیا کی اصل حقیقت سے واقف ہو جائیں۔ انہیں ان برائیوں سے روک دو اور صراط مستقیم کی طرف راغب کرو اور انہیں یہ بھی بتا دو کہ اس دنیا کے علاوہ ایک اور بھی جہاں ہے جس میں آپ کے اعمالوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور کہہ دو انہیں کہ یہ دنیا فانی ہے اپنے اگلے دنیا کے لئے سوچ جو ابدی ہے، ناختم ہونے والا ہے۔ یہی پیغام اللہ تعالی نے مقدس قران کریم میں بیان فرمایا۔ قران کریم ہیں ہر چیز واضح بیان کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص قران پڑھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے تو وہ اسلام کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ پھر کسی ملا کے ذاتی مفاد اور کسی شخص کے ورغلانے میں نہیں آتا اور اسلام کو غلط استعمال کرنے نہیں دیتا۔

اب ہم آتے ہیں اسلامی جمہوریہ پاکستان جہاں ایک اور اسلام وجود میں آیا ہے جس کو پاکستان صرف اپنی مشکل حالات میں استعمال کرتا ہے۔ 1971 کی بات ہے۔ بنگلہ دیش جہاں پاکستان نے اسلام کے نام پر مختلف تنظیمیں بنا کر بنگالیوں کا قتل عام کو جائز قرار دیا جس میں لاکھوں بنگالیوں کو قتل کیا گیا اور ان کی ننگ و ناموس کو تار تار کیا گیا۔

اسی اسلام کے نام کو استعمال کر کے پاکستان نے ڈیتھ سکواڈ زالشمس، البدر کے نام سے بنائے۔ آیا وہ مسلمان نہیں تھے۔ ہاں مگر آپ کے (پاکستانی) اسلام کے پیروکار نہیں تھے اور بنگالیوں کو انڈیا اور کفاری قوتوں کے ایجنٹ قرار دے کر قتل کیا گیا۔ جس وقت آپ خود کافر (امریکہ) کے بغل میں بیٹھ کر اس کے ڈالروں کیلئے اس کے ہر حکم پر ناچتے ہو امریکہ جو کہ پاکستان اور اسرائیل کو بچے کی طرح پال رہا ہے پھر یہی پاکستان کس طرح دوسروں کو کافر اور کافر کا ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ اسی اسلامی جمہوری ریاست نے ڈالروں کے لیئے امریکہ کو جگہ دے کر اپنے ہمسایہ ملک افغانستان کو آگ میں دھکیل دیا اور آج تک وہاں تعینات امریکی فوجیوں کو کمک دے کر معصوم افغانوں پر ظلم کرنے میں مدد کر رہا ہے۔ آیا محمدؐ کے اسلام نے یہی درس دیا کہ کسی غیر مسلم ریاست کی مدد کی جائے تا کہ ایک مسلم ریاست پر قبضہ کیا جا سکے تا کہ اپنا پیٹ پال سکے اور بحیثیت مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی قتل میں شریک ہو جاؤ؟

1971 کی طرح پاکستان ایک بار پر بلوچستان میں بلوچوں کے ساتھ اسی طرح ظلم کر رہا ہے جس طرح بنگالی مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ پاکستان بلوچوں کو مختلف قسم کو اذیت دے رہا ہے جو کہ اسلام اور دنیا کہ کسی قانون میں نہیں ہے۔ بلوچ اپنے حقوق کے لیئے لڑ رہے ہیں۔ پاکستان نے بلوچوں سے ان کی آزادی 27 مارچ 1948 کو چھین لی اور یہ حقیقت دنیا میں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں یہ سب کس کے کہنے پر ہو رہا ہے۔

اللہ تعالی قران پاک میں جہاد کے بارے میں فرماتا ہے جسے پاکستانی ملا منافقت اختیار کر کے اس کو کوئی اور رنگ دیتے ہیں لیکن قران کہتا ہے کہ ہر ظلم کے خلاف جہاد کرو جو ناجائز آپ کے حق پہ اپنا قبضہ جمائے یا جمانے کی کوشش کرے۔ وہ حق اسلامی روایت میں ننگ و ناموس، زمین اور دوسرے حقوق جو کہ اسلامی روایت میں آپ کے حق بنتے ہیں۔ محمدؐ نے مکہ سے ہجرت کر کے کہا کہ اے مکہ میں ایک دن آپ کو ضرور آزاد کرونگا۔ اس الفاظ میں واضح ہے کہ وہ اپنے ملک کو اس ظالم سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ اس طرح آپ خود دھولیں اس میں دیکھیں کہ اس اسلام کے پیروکار جو اسلام کے نام پہ ایک دھبہ ہیں اسی نے, 27 مارچ 1948 کو بلوچ ریاست پر بزور طاقت قبضہ کر کے بلوچوں کو لادین قوم کا غلام بنا دیا ہے۔ یہ حقیقی اسلام کے کونسے روایات میں ہے کہ ایسے کرو۔ نام نہاد اسلامی ریاست جو کرے وہ جائز ہو یا ناجائز اس کو اسلام کی فل اتھارٹی حاصل ہے۔ لیکن بلوچ نوجوانوں کو قتل کیا جاتا ہے اور مختلف قسم کی اذیتیں دی جاتی ہیں اور اگر وہ اپنے حق آزادی کے لئے جہاد کریں تو وہ کافر کا ایجنٹ یا کافر ہوگا۔ ہاں ہم پاکستان کے اسلام کے کافر ہے۔ لیکن وہی اسلام جو اللہ کے نبیؐ نے پہنچایا اس میں ہم برحق ہے۔ ہمیں خود پاکستان کے پیدا کردہ اسلام کی ضرورت نہیں وہ انہیں مبارک ہو۔ اسی ریاست نے بنگلہ دیشی طرز کے کچھ اسلامی لشکر اور خود ساختہ تنظیمیں بنائیں ہیں جو کہ مختلف

قسم کے قتل وغارت گری میں مصروف ہے۔کبھی ان قتلوں کو سپاہ شہدا تو کبھی عمر فاروق کے نام سے قبول کیا جاتا ہے۔اس طرح کے اسلامی ناموں سے لوگوں کو بیوقوف بنا کر اپنے آپ کو اسلام کا ٹھیکدار سمجھتے ہیں۔لیکن پوری امت مسلمہ پاکستانی اسلام کے پیروکاروں سے اچھی طرح واقف ہے کہ وہ کس اسلام کے باتیں کرتے ہیں۔ان لوگوں نے اس مقدس اسلام کو بدنام کر رکھا ہے۔اسلام کے نام پر لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے اب ووٹ بینک اور پیٹ پوجا اور اپنے ذاتی مفاد اور دوسرے کئی قسم کی برائیوں کو چھپانے کے لیئے اسلام کا سہارا لیتے ہیں اور اب یہ وہ دور نہیں کہ جب آپ نے بنگالی مسلمانوں کا قتل عام کر کے انہیں کافر قرار دیا مگر آج کل ہر مسلمان باشعور ہو چکا ہے اور وہ جانتے ہے کہ پاکستان اور پاکستانی ملاکس اسلام کا بولنا بولتے ہیں۔

یہی ریاستی ڈیتھ سکواڈ اور ائی ایس ائی کے کارندے جو بلوچ مزاحمت کاروں کو کافر کا ایجنٹ یا اسرائیل کے کارندے اور دیگر ناموں سے نوازتے ہیں تقسیم مسلمانان ہند سے پہلے خود کافر کے ایجنٹ تھے اور آج معصوم بلوچ نوجوانوں کو اغوا کر کے اسے اپنے مصنوعی اسلام کے ریاست کے ٹارچر سیلوں میں مختلف قسم کے اذیت دے کر انکو شہید کیا جاتا ہے اور انکی لاشوں کو ویرانوں میں پھینکتے ہیں۔جہاں جنگلی جانور انکی لاشوں کو نوچتے ہیں مگر تاریخ میں محمدؐ کے اسلام کے پیروکاروں نے انسانوں سے اس طرح کی سلوک نہیں کی اور نہ ہی کسی کافر نے ایسا کیا ہے۔اس میں اگر منافقت سے نکلیں اور حقیقت کو دیکھیں اور اسلامی نام عمر فاروق کی حقیقت کو جانیں تو سلام ایڈوکیت کی پانچ سالہ بچی کو شہید کرنا اور جمیل یعقوب کے جسم کو کاٹ کر اس کے دل کو نکال کر اس کے دل کی جگہ اپنے آقا کی جھنڈا رکھنا،شہید رسول بخش مینگل اور نثار مینگل کی پیٹھ پر نام نہاد اسلامی ریاست پاکستان زندہ باد لکھنا ۔۔ان سب کی درس پاکستانی اسلام ہی دیتا ہے دین محمدی نہیں۔

اگر آپ بلوچ مزاحمت کاروں کو کافر کا ایجنٹ قرار دیتے ہو اور اپنے آپ کو عمر فاروق کے نام سے منسوب کرتے ہو تو یہاں پاکستانی اور محمدی اسلام میں فرق صاف ظاہر دکھائی دیتا ہے کیونکہ بلوچوں نے آج تک کسی پاکستانی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا۔بلوچ مزاحمت کار ایک مظلوم اور محکوم کی بقاء کی خاطر جنگ لڑ رہے ہیں اور اسلام اور مہذب دنیا کی قوانیں کو سامنے رکھ کر اپنی جدوجہد کر رہے ہیں۔اب آپ جو بھی کرلیں آپ کے اسلام اور قوم دوستی دنیا کے سامنے عیاں ہو چکی ہیں۔گزشتہ دنوں بی بی سی کے کالم نگار نے آپ کے اس مصنوعی اسلامی ریاست کے سب کچھ کھول کر رکھ دیا اگر اب بھی کوئی آپکی آقا کی اسلام پر بھروسہ کرے تو وہ اسکی اپنی نادانی ہوگی۔اگر کوئی اپنے پیٹ پالنے اور چاپلوسی کرنے میں کرایے کا قاتل بنے تو پھر سوچئے کہ جس ریاست کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے بنایا گیا جو اسلام کو استعمال کر کے ہر برائی کر رہا ہے۔اسلام اس ملک میں بطور آئی ایس آئی اور اسکے ایجنٹ منشیات فروش،چور،لٹیروں کی دفاع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔اور اس اسلامی ریاست کے وزیروں کو ابھی تک سورہ اخلاص نہیں آتا جو بلوچ مزاحمت کاروں کو کافر کا ایجنٹ کہنے سے نہیں تھکتا اور اسی اسلامی ریاست کے منسٹر شراب پانی کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور دن رات نشے میں ہوتے ہیں۔

ریاست کی اپنی سٹرکچر کی کوئی خاصیت نہیں ریاست خودمختار ہوتے ہیں انکی اپنی باونڈری ہوتی ہے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں۔کبھی نیٹو کی جہاز آکر بمباری کر کے چلا جاتا ہے تو کبھی امریکی جہاز آتے ہیں۔دنیا میں بہت سی ریاستیں ہیں انکی خودمختاری کی کوئی خلاف ورزی نہیں کرتا مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہاں ڈالروں سے بولی لگتی ہے۔اس ملک سے اپنی امیدیں وابسطہ کرنا اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھنے کی مترادف ہے۔ادھر کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔نہ کوئی قوم نہ کوئی اسلام اور نہ ہی جمہوریت۔صرف بزنس اور اپنی خواہشوں کو پورا کرنے اور دوسرے اسلامی ملکوں کے سامنے اپنی وجود برقرار رکھنے کے لیئے اسلام کا مقدس نام استعمال ہو رہا ہے۔

میں بحیثیت ایک لکھاری یہی کہتا ہوں کہ پاکستانی اسلام آئی ایس آئی اور اسکے ایجنٹوں کا پیدا کردہ اسلام ہے وہ اسلامی نام استعمال کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں لیکن باشعور بلوچ ان کے حقیقت سے واقفیت رکھیں تاکہ وہ محمدؐ کے اسلام اور پاکستانی اسلام میں تمیز کر سکے اور پاکستانی اسلام اور انکے ایجنٹوں کے ذاتی مفادات کیلئے استعمال نہ ہو۔

میرے وطن کی رونقیں بحال کر دو

روبینہ بلوچ

میرے وطن بلوچستان میں ہر طرف میرے ہم وطن بلوچوں کی خون ریزی ہو رہی ہے میرے وطن کے فرزندوں کی لاشیں ویرانیوں میں پھینک دی جاتی ہیں ایسے جانثار فرزند میرے وطن اور قوم کے سرمایہ ہیں جب ان جانثار فرزندوں کی مسخ شدہ لاشیں ویرانیوں میں پھینک دی جاتی ہیں اُس وقت ظالم یہ سوچ کر درندگی کرتا ہے کہ مظلوم قومیں اپنے بہادر نوجوانوں کی لاشیں دیکھ کر ٹوٹ جائیں گے یا خوف و ہراس میں مبتلا ہونگے تو یہ وحشی ظالم کی غلط سوچ ہے۔مظلوم قومیں اپنے بہادر نڈر نوجوانوں کی لاشیں وصول کر کے اپنے مقصد سے دستبردار نہیں بلکہ غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جستجو میں لگ جائیں گی۔

قربانیوں سے قوم کے حوصلے بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے بہادر فرزندوں کی لاشیں دیکھ کر فرزندان وطن غلامی کی طویل نیند سے بیدار ہونگے اگر ظالم دشمن ایک بہادر فرزند کو پھانسی پر لٹکائے گا اس کے ردعمل میں 100 نوجوانوں کو غلامی کی غفلت بھری نیند سے بیداری ملے گی اگر ظالم سو فرزندان وطن کی لاشیں پھینک دے تو ہزاروں مظلوم وآزادی پسندوں کو اپنے حق سے آگہی ملے گی، اگر قابض یہ سوچ رکھ کر بلوچ قوم کے لیے ان کے آزادی پسند فرزندوں کی لاشیں باعث خوف و ہراس ہوں گی تو یہ دشمن کی شکست خوردہ سوچ کی علامت ہے آزادی کے جہدکار مسخ شدہ لاشوں اور دشمن کے کمزور ٹارچرسیلوں سے خوف زدہ یا کمزور نہیں بلکہ زیادہ مظبوط اور منظّم ہوجاتے ہیں۔

یہ زندگی ہمارے پاس ایک امانت ہے اگر زندگی کو مقصد مل جائے تو ہمیں زندگی کا سب کچھ موصول ہوجاتا ہے کیونکہ زندگی مقصد کے حصول کا نام ہے بغیر مقصد کے زندگی بے رونق ہوتی ہے۔مقصد کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، تکالیف اور مشکلات برداشت کرنے پڑتے ہیں،۔

اگر کسی قوم کے فرزندان اپنے حُب الوطنی کے جزبات کو اُجاگر کر کے اپنا مقصد قوم کی بقاء کے تابع کریں قوم ووطن کے عظیم مقصد ''آزادی'' حاصل کرنے کو اپنا مقصد بنائیں اس عمل سے زاتی مفادات کی نفی اور عظیم قومی مقصد زندگی بن جاتی ہے وطن وقوم کے نام اپنی زندگی کو بطور امانت سمجھنا ہمیں ایک ایسے عمل سے استفادہ کر لیتی ہے کہ ہم اپنے نفس کو قابو میں کر لیتے ہیں اور خواہشات کو خود میں سمیٹنے سے گریز کر لیتے ہیں۔اپنے نفس کی کمزوریوں میں انقلاب برپا کر دیا جائے تو حصول آزادی کی راہ میں آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں ہماری زندگی ہماری موت ہمارے مفادت ہمارے قوم ووطن کے تابع ہونے چاہیے ہیں۔

نڈر نوجوان بھوک اور پیاس سے مرتے نہیں اپنی قومی غلامی کے تکلیف کو محسوس کرتے ہیں محاذ پر برسرپیکار بلوچ سرمچاروں کے مفادات صرف ان کے قوم کی آزادی سے منسلک ہیں جو پہاڑوں میں بلوچ قومی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔بلوچ سرمچاروں کی عظیم جدوجہد آزاد، خوشحال اور پُرامن وطن وقوم کیلئے ہے اس جدوجہد میں ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اگر پہاڑوں میں نڈر بلوچ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ہمیں سیاسی میدان میں ایسا عمل سرانجام دینا چاہئے کہ جس سے کاروان آزادی آگے بڑھتا جائے اگر ہمارے نڈر و بہادر بلوچ تیزی سے طاقت، ہمت وجُرات سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ہمیں بھی اپنے بلوچ سرمچاروں کے اس عمل کو سراتے ہوئے ایسا عمل سرانجام دینا چاہئے جس سے ان کی پُرزور حمایت نظر آئے، زندگی کا یہ پہلو بھی عمل کے بغیر مکمل نہیں اور کوئی عمل کیا جائے تو مستقل کیا جائے اور قومی مفاد میں کیا جانے والا عمل آزادی کے راہ کے کانٹوں کو جڑ سے اُکھاڑ سکتا ہے اگر قبضہ گیر ہمارے بلوچستان میں مظلوم وآزادی پسند بلوچوں کو گولیوں سے چھلنی اور مسخ شدہ لاشوں کو ویرانیوں میں پھینک دیتا ہے ہمارے

آزادی کی ایک دیوار کو گرا دینے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اُس شہید کے بدلے کی دیوار کیوں نہ بنیں؟ قبضہ گیر درندگی کرتا ہے ظلم و جبر کرتا ہے اس لیے تاریخ میں وہ قابض ظالم و جابر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں لیکن ظلم سہنے والا تاریخ سے مٹ جائیں گے اُس قوم کو تاریخ میں یاد نہیں کیا جائے گا،، ظلم سہنے والا ظلم کرنے والا برابر کے گناہ گار ہوتے ہیں ہم بلوچوں نے ظلم سہنے کے بجائے آزادی کے پاک مقصد کو منتخب کیا ہے جس کا ہماری قوم و وطن مستحق ہیں ہم ظلم سہنے کے گناہ سے آزادی کے پاک مقصد کو ترجیح دیتے ہیں ہماری قوم کی وہ بہا در مائیں جن کے لختِ جگر ویرانیوں میں پھینک دیئے جاتے ہیں ازقبل کسی اطلاع کے ان بہادر ماؤں کو ان کے دل کی تڑپ پہلے ہی ان کے لختِ جگر کے شہید ہونے کی اطلاع دے چکی ہوتی ہے اور قوم کی وہ بہادر بہنیں جو اپنے بھائیوں کی ٹارچر سیلوں سے آنے کے منتظر ہوتے ہیں جب ان کے بھائیوں کی مسخ شدہ لاشیں ظالم بے ضمیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ویرانیوں میں پھینک کر چلا جاتا ہے۔ تو ایک بے بس بہن اپنے بھائی کے حصے کی دیوار بن جاتی اور آزادی کے راہ میں انقلاب کو زیادہ بہتر طریقے سے برپا کرتی ہے ایک فرد کے ساتھ ایک یا دو نہیں بہت سے رشتے منسلک ہوتے ہیں اور وہی فرد اپنے قوم و وطن کے فرائض سے منسلک ہوتا ہے جو لوگ ڈر و خوف منافقت بھری نیند کو آزادی کی جدوجہد سے بہتر سمجھتے ہیں تو انھیں اس بات پر غور و فکر کرنی چاہیئے کہ غلامی انسان کو اندرونی طور سے کھوکھلا بنا دیتی ہے ایسے ہی جیسے آگ خشک لکڑی کو پکڑ کر راکھ بنا دیتی ہے تو جو فرزندان وطن اگر آزادی کی جدوجہد سے دور ہیں تو انھیں چاہیئے کہ ظلم سہنے اور سامراج کی غلامی سے زیادہ آزادی کے پاک مقصد کو ترجیح دیں اگر خدا نے ہمیں خود مختار بنایا تو ایک انسان کی غلامی کیوں کریں یہ عزم بناؤ اور آواز اُٹھاؤ اپنے اور اپنے قوم کے حق کے لیے عمل کرو اپنے اس علم پر عمل کرو جس نے سب سے پہلے تمہیں حق کے لیے آواز اُٹھانے کا درس دیا وقت اور حالت محکوم و مظلوم قوم سے اتحاد و اتفاق کی التجا کرتی ہے ہم سب کا مقصد آزادی ہے تو راہ بھی ایک ہے اب بلوچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق اور اتحاد آپس میں برپا کر کے آگے بڑھنا ہوگا تا کہ دشمن ہماری کوئی کمزوری نہ دیکھ پائے۔ دنیا ہر بات کی دلیل مانگتی ہے جس نے عمل سے کام لیا ہو دنیا اس کے راستے پر چلتی ہے ہمیں پارلیمانی زرخرید پارٹی لیڈران کے دکھاؤ سے خود بھی بچنا ہے اور قوم کو بھی بچانا ہے بلوچستان کی ہر بیٹی کو بانک کریمہ بلوچ، بانک فرزانہ بلوچ، بانک شکر بی بی بلوچ اور باقی جہد آزادی میں حصہ لینے والے قوم کی بیٹیوں اور ماؤں کی طرح حق و سچ و آزادی کی جنگ میں اپنا لوہا منوانا پڑے گا صرف آزادی کے جنگ سے بلوچستان کی رونقیں بحال ہوسکتی ہیں۔ ہر ایک محکوم و آزادی پسند بلوچ کے ضمیر سے اُٹھتی ہوئی صدا اور ہر جذبے کی خاموشی میں چھپی ہوئی بلند آواز یہی کہتی ہے کہ

''میرے وطن کی رونقیں بحال کردو''

جو کوئی بھی انقلابی لوگوں کی حمایت کرتا ہے وہ انقلابی ہے اور جو کوئی بھی سامراجیت، جاگیرداری، افسر شاہی اور سرمایہ داری کا حامی ہے وہ انقلابی قوتوں کا دشمن ہے۔ جو کوئی بھی الفاظ کے ذریعے انقلابی لوگوں کی حمایت کرتا ہے لیکن اپنے عمل میں اسکے خلاف ہے تو وہ فقط زبانی طور پر انقلابی ہے لیکن جو کوئی عمل اور الفاظ دونوں کے ذریعے انقلاب پسندوں کا حامی ہے وہ صحیح معنوں میں انقلاب پسند ہے۔

ماؤزے تنگ

انقلاب اور جنگ

برمش بلوچ

ا+ن+ق+ل+ا+ب=انقلاب: لفظ انقلاب شاید پڑھنے اور لکھنے میں آسان ہے لیکن حقیقتً فلسفہ انقلاب گہری سمندر کی مانند ہے پرسودہ نظام ،روایات ،سامراجی طرز زندگی ،سماجی نہ انصافی کے تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں انقلاب کے لئے اپنی زندگی آسائش قربان کرنے پڑھتے ہیں انقلاب کے لئے خون کے نہرے بہانے پڑھتے ہیں انقلاب نہ جانے کتنے ماں باپ سے ان کے بچوں کو جدا کرتی ہے اور کتنے بچوں کو ماں باپ سے جد اکرتی ہے مگر میرے قریب انقلاب سے نہ کوئی خوبصورت لفظ ہیں اس جہاں میں اور نہ ہے کوئی خوبصورت لحہ جو انقلابی جدوجہد میں گزرے کیونکہ انقلاب ایک ایسا خوشبوں ہیں جو انسان کو اس معاشرے میں انسانی درجے سے نوازتا ہے۔

انقلاب معاشرے میں انقلابی تنظیم ،انقلابی لیڈرشپ اور انقلابی کارکنان کے ذریعے برپا ہوتا ہے انقلاب کو منظم اور کامیاب کرنے کیلئے انقلابی تنظیم میں پرسودہ روایات کا خاتمہ اور انقلابی قانون کے پابند ہونا لازم ہے انقلابی لیڈرشپ کو انقلابی پروگرام اور انقلابی فیصلے پابندی کے ساتھ کرنے ہوتے ہیں اور انقلابی کارکنان کو انقلاب کے نظم وضبط کے پابند ،قوت برداشت پیدا کرنا اور انقلابی تعلیم پ عمل کرنا ہوتا ہے۔

آزاد خیالی ،زاتی خواہش ،خود پسندی ،جھوٹ ،فریب انقلاب دشمن شے ہوتے ہیں اگر اس بیماریوں سے ایک بھی بیماری انقلابی شخص میں آگئی وہ شخص انقلاب کیلئے نقصان دہ ہوگا جیسا کہ آج ہمارے درمیان چند ایسے شخصیت موجود ہے جو انقلاب کے نام پر کینسر جیسی بیماریاں ہے اپنی آزاد خیالی ،خود پسندی اور زاتی خواہش کے مطابق انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں جو انقلابی اصولوں کے متضاد ہے شاید ہمارے درمیان ایک سوچ پائی جاتی ہے کہ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہوگا آزاد خیال اور خود پسند لوگ انقلاب کے پابند ہونگے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ انقلاب سمندر کے مانند ہوتی ہے جو اپنے اندر آنے والے تمام گندگیوں کو باہر نکال کر پھینک دیتی ہے۔

انقلابی تحریکوں میں انقلابی لیڈرشپ کو بروقت ایسے فیصلے اور پروگرام کرنے ہوتے ہیں جس سے انقلاب کو نقصانات سے بچایا جاسکتا ہے ایسے فیصلوں سے شاید کمزور لوگوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں اور وہ ایسے فیصلوں کے مخالفت کرتے ہیں یہاں تک کہ انقلاب اور تحریک مخالف پروپیگنڈا شروع کرتے ہیں اس مرحلے میں لیڈرشپ کو انقلابی فیصلوں کی سختی کے ساتھ پابند ہونا پڑتا ہے کیونکہ انقلاب اور جنگ کسی کے خواہش اور منشاء کے مطابق نہیں ہوتے ہیں انقلاب اور جنگ وقت اور حالات کے مطابق ہوتے ہیں دنیا کے سیاسی ،معاشی اور جنگی حالات کو مدنظر رکھ کر حکمت عملیاں ترتیب دی جاتی ہے انقلابی حکمت عملی انقلابی تنظیم تشکیل دے سکتی ہے نہ کہ کوئی آزاد خیال اور خود پسند گروہ اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ آزاد خیال اور خود پسند گروہ سب سے زیادہ انقلابی ہونا کا دعوا کرتا ہے لیکن اُس کے عمل انقلاب دشمن ہوتے ہیں ایسے انقلاب دشمن گروہ کی کردار کو واضح نہ کرنا اور اُس کے انقلاب دشمن کردار پر خاموش ہونا اپنے ہاتھوں سے انقلاب کے خون کرنا کا مترادف ہوتا ہے۔

جبکہ انقلابی جنگیں قوموں کو پیدائشی ورثے میں نہیں ملتے ہیں مظلوم قومیں اپنے حق ،قومی بقاء ،ننگ وناموس کی حفاظت کے لئے جنگ کی ابتداء کرتے ہیں تاریخ میں ایسی کوئی واقعہ نہیں جنگ کی جو مظلومات کے بغیر لڑی گئی ہوں اگر دنیا میں کوئی تحریک چلی ہیں تو وہ قابض نوآبادیات جاگیرداریت سرداریت کے خلاف اپنی بقہ اور قومی شناخت کی خاطر جنگ لڑتے تھے اور آج تک لڑ رہے ہیں

تاریخ میں ہم دو قسم کے جنگوں سے آشنا ہے منصفانہ اور غیر منصفانہ۔۔۔ہم

منصفانہ جنگوں کی حمایت کرتے ہیں جبکہ غیر منصفانہ جنگوں کی مخالفت کرتے ہیں تمام انقلاب دشمن جنگیں غیر منصفانہ ہوتی ہے اور تمام انقلابی جنگ منصفانہ ہوتی ہے غیر منصفانہ انقلاب دشمن جنگ آج بھی ہماری سروں میں منڈلا رہی ہے اگر ہم نے منصفانہ جنگ کا پرچم بلند نہ کیا تو بنی نوع انسان کی غالب اکثریت بے پناں مصائب میں مبتلا رہے گی بنی نوع انسان کی منصفانہ جنگ کا پرچم بنی نوع انسان کی نجات کا پرچم ہے

جنگیں قوموں کو زندہ رکھتی ہے اور ان قوموں کی صدیوں کی تاریخ دوراتی ہے جنگ کے نظری یا عملی میدان سے تعلق رکھنے والے پچھلے کسی بھی ماہرین نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ اگر ایک کمزور فوج کسی طاقتور فوج کے ساتھ لڑ رہی ہوں تو اسے جنگ کی ابتدائی مرحلے میں ''مارو اور بھاگو'' والی پالیسی اختیار کرنی چاہئے ایک غیر ملکی فوجی ماہرین کا کہنا ہے حکمت عملی پر مبنی مدافعانہ کاروائیوں کے دوران ابتداء میں غیر موافق فیصلہ کن لڑائی سے بالعوم پہلے تئے کی جاتی ہے اور ایسی لڑائیاں صرف اسی وقت لڑی جاتی ہیں جب صورت حال سازگار ہو جاتی ہے جبکہ منصفانہ جنگ میں عوامی حمایت اولی درجہ رکھتا ہے جس خطہ میں جنگی کاروائی ہوں اس خطے کے بارے میں معلومات حاصل ہوں اور دشمن کے کمزوریوں کا مطالعہ کرے انقلابی جنگ میں عوامی حمایت اس لئے ضروری ہیں کہ دشمن کمزور ہو جاتا ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دشمن اپنی کاروائیوں کو ختم کرے گا بلکہ زیادہ جبر اور بربریت کا مظاہرہ کرے گا جب دشمن اپنی تمام تر توانائیوں کو ایک طرف استعمال کرے گا تو انقلابیوں کیلئے لازم ہے کہ وہ اُس کی کمزور جانب حملہ کرے جس سے دشمن کو شدید تکلیف ہوگا اس طرح کے حملوں سے دشمن کے حوصلے پست ہونگے انقلابی جنگ میں یہ مقصد بہت خاص ہے کہ دشمن کو غلطیاں کرنے کی ترغیب دی جائے یا اس کی غلطیوں کا پتہ لگایا جائے یہ بات ذہین نشین کرنا ضروری ہے کہ دشمن کا کمانڈر خواہ وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہوں نسبتاً طویل عرصے میں کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرتا ہے ہمارے لئے ہمشیہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ایسے مواقع سے جو وہ ہمارے لئے پیدا کر دیتا ہے فائدہ اٹھایا جائے دشمن سے بھی غلطیوں کا ارتکاب ہوسکتا ہے بلکل ایسے کہ ہم خود بعض اوقات غلط اندازہ لگاتے ہیں اس طرح دشمن کو فائدہ اٹھانے کے مواقع مہیا کرتے ہیں علاوہ ازیں ہم خود اپنی کاروائیوں سے دشمن کو یہ ترغیب دے سکتے ہیں کہ وہ غلطیاں کرے مثال کے طور پر بقول سن زو جھلک دکھنا یعنی جھلک مشرق میں دیکھائے لیکن حملہ مغرب میں کیا جائے

دشمن پر حملے کرنے کے وقت اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہیں کہ ہم جنگی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹیں گے دشمن اپنی قلعہ بندیوں کو ایک قدم آگے بڑا ھائے گا اس طرح سے وہ کھویا ہوں علاقہ واپس نہیں لے سکتا ہے دشمن پر حملے کرنے اور جنگ میں دشمن کو شکست سے دوچار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انقلابی فوج اپنے نظم وضبط کے پابند ہو اور اپنے کمزوریوں اور غلطیوں پر مسلسل نظر ثانی کرے تا کہ دشمن کا جڑ سے خاتمہ کرے اور اس طرح جنگ میں جیت حاصل ہوگی۔

ہماری فوج مضبوط ہے کیونکہ اس کے تمام سپاہی تنظیم کا شعور رکھتے ہیں وہ خود جمع ہوئے ہیں اور چند مفاد پرست لوگوں یا کسی تنگ نظر گروہ کی خاطر نہیں لڑتے، بلکہ وہ عوام اور ساری قوم کیلئے مصروف پیکار ہیں۔اس فوج کا بڑا مقصد تہ دل سے چینی عوام کی مدد کرنا اور ہر مصیبت میں ان کے کام آنا ہے

☆☆☆☆☆ ماؤزے تنگ ☆☆☆☆☆

جنگ آزادی میں ھی قومی نجات ھے۔ بی ایس او (آزاد) کی جانب سے جاری کردہ پمفلٹ

ادارہ

قومی جذبہ آزادی سے سرشار ہزاروں جہدکار ایک ظالم اور انسانیت سے عاری دشمن کے سامنے دیدہ دلیری سے جد و جہد کر رہے ہیں۔۔۔آرام کی زندگی، عیش وعشرت اور انفرادی کامیابی کے نشے سے دور آزادی کی تڑپ اور انقلابی نظریہ سے لیس بلوچ قومی پارٹیاں اپنی سرزمین بلوچستان میں پاکستانی پنجابی فوج اور اس کے دلالوں کی نیندیں حرام کر چکے ہیں اور بلوچستان پر اپنے قبضہ اور ظلم وستم کے خاتمے کو دیکھ کر حواس باختہ پاکستان اپنے میڈیا، عدلیہ، پارلیمنٹ، فوج اور قوم پرستی کے بھیس میں دلالوں کے ذریعے اپنے آخری حربوں کو آزما رہا ہے اب جبکہ پاکستان کے گماشتہ سیاستدان قوم پرستی کے نام پر عوام کے اندر نہیں جاسکتے تو فوج نہتے عوام کو بندوق دکھا کر عوام میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہیں راشن تقسیم کرنے اور امداد دینے کے نام پر عوام کو اپنی غلامی تسلیم کرانے کی کوشش کر رہا ہے تو کہیں آزادی پسندوں کے وال چاکنگ مٹا کر اور اپنے حق میں نعرے لکھوا کر اور اپنی دلالوں اور زرخریدوں کے ذریعے تحریک آزادی اور بلوچ آزادی پسندوں کے خلاف اپنی شکست کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ عدالتوں اور اسمبلیوں میں کچھ ڈرامے کر کے اپنے میڈیا کے ذریعے بلوچ عوام کے ذہنوں میں یہ باتیں بٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آزادی کے مقصد کو ترک کر کے اپنے علاقوں میں ہر پانچ سال بعد نمودار ہونے والے پارلیمانی سیاستدانوں سے امید وابستہ رکھیں تا کہ یہ گماشتہ سیاست دان قوم پرستی اور نوکری ومراعات کے نام پر بلوچ عوام کی توانائیوں اور ان کی سوچ کو پارلیمنٹ کی طرف راغب کر کے انہیں ان کے تاریخی فریضہ قومی آزادی کی جدو جہد اور اپنے سرزمین سے قبضہ گیر کو نکال باہر کرنے سے فراموش کرا دیں جس طرح انہوں نے 1988 میں بلوچ عوام کو پارلیمنٹ میں لے جا کر تحریک آزادی کو وقتی طور پر ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن گزشتہ ایک دہائی سے زائد کے جہد مسلسل نے اور شہید اکبر خان، شہید بالاچ، شہید غلام محمد، شہید لالا منیر، شہید شیر محمد سمیت ہزاروں بلوچوں کی قربانیوں نے بلوچ عوام کو وہ تاریخی وقومی شعور دیا ہے کہ اب وہ اپنے محسن آزادی پسندوں اور اپنے دشمن پنجابی اور اس کے دلالوں کو اپنے تمام تر حربوں کے باوجود پہچان سکتے ہیں۔۔۔

بلوچ عوام کے اسی شعور نے ہی تو جہدکاروں کی قربانیوں اور اسیران کی تکلیفوں کو اپنے سینے میں جگہ دیکر جدو جہد کو اس مقام تک پہنچایا ہے جہاں پاکستان اپنے تمام وسائل اور اپنے تمام حربوں کو شدت کے ساتھ استعمال کر کے بھی اپنی شکست اور اپنی تباہی کو نہیں روک پا رہا ہے جسے بھانپتے ہوئے ایک طرف تو الیکشن کا راگ الاپ کر اپنے دلالوں کو میدان میں متحرک کر دیا ہے تو دوسری جانب اپنے قبضہ گیر فورسز و کرایہ کے قاتلوں کو بھی میدان میں چھوڑ دیا ہے جو کہ آئے دن بلوچستان بھر میں بلوچ فرزندوں کا قتل عام کر رہے ہیں تا کہ اپنے حربوں کی ناکامی کی صورت میں جاری نسل کشی کو تیز کر دیں جس طرح بنگلہ دیش میں اپنی شکست کو سامنے دیکھ کر پنجابی فوج درندگی پر اتر آئی تھی۔

بلوچ فرزندو۔۔۔!

قومی تحریک کی آبیاری ہمارے خون سے ہوئی ہے اور ہر فیصلہ کن مرحلے پر تحریک کے مستقبل کا فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں ہے جس طرح اب تک شہدا، اسیران اور جہدکاروں کی شکل میں جدو جہد کو عوام کا میابی کے مراحل تک لے گئے ہیں اور قتل عام سے لیکر مسخ شدہ لاشوں کے پھینکنے اور عوام کو خوفزدہ کرنے کے حربوں کا سامنا کیا ہے اسی طرح اب پاکستانی حربوں کا مقابلہ کرتے ہوئے الیکشن جیسے تباہ کن حربے کا سامنا بھی اسی جذبے کے ساتھ کرنا ہے اور الیکشن کو ناممکن بنا کر ایک تاریخ رقم کرنی ہے تا کہ قومی آزادی، انصاف اور برابری کیلئے اس جدو جہد" جو کہ ہزاروں شہدا کے خون کی امانت ہے" کو منزل تک کامیابی سے پہنچائیں۔

یاد رکھئے۔۔۔

کہ پاکستان کو اپنی سرزمین سے باہر نکالنے کیلئے شہدا کی خون سے کھینچی لکیر ہی ہماری نجات کا واحد راہ ہے۔ اگر آج ہم اس راہ سے بھٹک گئے تو شاید صدیوں تک ہمارے آنے والی نسلیں نجات کو ترسیں۔

Wake Up on the Call Of Revolution

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد)

آئینہِ حقائق

چیدہ چیدہ حالات، واقعات اور خبروں پر آزاد کا ماہانہ تجزیہ

قائم خان بلوچ

یومِ شہداء، شہید بالاچ ڈے، بی ایس او کا یومِ تاسیس، حق نواز بگٹی، اللہ رحم، اسلم ڈگارزئی شہید، نواب نذر اغواء۔ ماہِ نومبر میں بلوچ قوم کی مادر سرزمین نے دشمن کی گولیوں کا نشانہ بننے والے اپنے فرزندوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ سرزمین پر جان نچھاور کرنے فرزندوں کے فکر و فلسفے کو آگے بڑھانے کے عہد و پیمان بھی ہوتے دیکھ لیئے۔ اپنے فرزندوں کو ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے بھی دیکھا۔ اغیار و قابضین و دلالوں کو اپنی چھاتی پر رقصِ محفل سجاتے بھی برداشت کیا۔

ماہِ نومبر کے اوائل میں ہی بلوچ مسلح تنظیم بی ایل اے کا ایک بیان اخبارات میں چھپا کہ 13 نومبر کو بلوچ قوم یومِ شہداء کے طور پر منا کر بلوچ شہداء سے یکجہتی کا ثبوت دے۔ جسکی بی ایس (آزاد) اور دیگر کچھ تنظیموں نے حمایت کی۔ البتہ بی آر پی، بی این ایم نسبتاً خاموش رہے۔ 13 نومبر کو یومِ شہداء کے طور پر منانے کی تجویز اس سے پہلے بھی 2010 میں بی ایس او (آزاد) نے دی تھی۔ اس مرتبہ بی ایل اے کے اعلان نے اسکو عملی جامہ پہنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 12 نومبر کو بی ایل اے کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ 13 نومبر کو بلوچ قوم شہداء سے یکجہتی کیلئے بلوچ اسیران کے کیمپ میں خاموش مظاہرہ کرے اور یہ بھی اعلان کیا کہ تمام آزادی پسند تنظیموں اور پارٹیوں سے مشاورت کے بعد بلوچ شہداء یکجہتی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جسکا باقاعدہ اعلان 20 نومبر کو کیا جائے گا جو بلوچ شہداء کے لواحقین سے رابطے میں رہے گی۔ 13 نومبر کو بلوچ قوم نے یومِ شہداء کے طور پر بھر پور طریقے سے مناتے ہوئے ریلیاں، مظاہرے اور ریفرنسز منعقد کیئے۔ قوم میں شعور و آگاہی پھیلانے کیلئے بی ایل اے کی جانب سے پمفلٹ تقسیم کیئے گئے جس میں شہداء کے فکر کو آگے بڑھانے کا عزم کیا گیا۔

اس بات کی ضرورت تو شروع ہی سے محسوس کی جارہی تھی کہ تمام بلوچ شہداء کا کوئی ایک دن مخصوص ہوتا کہ کسی ایک خاندان، پارٹی یا تنظیم کے شہیدوں کی برسیاں منانے اور باقیوں کو نظر انداز کرنے کی روایت چل رہی تھی اس پر قابو پایا جاسکے۔ یقیناً چند مخصوص شہداء کی برسیاں منانا اور باقیوں کو جو ہزاروں کی تعداد میں معلوم و نامعلوم ہیں انکو نظر انداز کرنا انکی قوم و سرزمین کیلئے دی جانے والی قربانی کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بلوچ قوم نے یومِ شہداء کو جس جوش و خروش و قومی جذبے سے منایا وہ یقیناً قابلِ دید تھی۔ مگر یومِ شہداء کے سوال نے ایک حقیقت بھی واضح کردی کہ آزادی پسند سیاسی و مسلح تنظیموں میں دوریاں، اور رابطوں کا فقدان بھی پایا جاتا ہے۔ مسلح تنظیم بی ایل اے نے 13 نومبر کو یومِ شہداء کے طور پر منانے کے اعلان سے پہلے کسی سیاسی لیڈر یا دیگر آزادی پسند سیاسی و مسلح تنظیموں سے صلح و مشورے کیئے کہ نہیں وہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ 13 نومبر پر کسی بھی سیاسی پارٹی یا تنظیم کو شاید ہی کوئی اعتراض ہو کیونکہ 13 نومبر ہی وہ سیاہ دن ہے جس دن انگریز سامراج نے بلوچ قوم کی خودمختاری پر شب خون مار کر محراب خان کو اسکے ساتھیوں سمیت شہید کرکے بلوچ سرزمین پر قبضہ جمالیا اور اسی دن سے بلوچ فرزندوں کے قربانیوں کا تسلسل جاری و ساری اور شہداء کی فہرست میں روز بہ روز اضافہ ہورہا ہے۔ شہید محراب خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیگر شہداء بھی سرزمین پر جان نچھاور کررہے ہیں۔ مگر ایک بات تو طے ہے کہ کوئی بھی فیصلہ باہمی مشاورت و آپس کے صلح و مشورے سے طے پائے تو پائیدار اور مضبوط ہوتا ہے۔ یومِ شہداء کے حوالے سے آزادی پسند تنظیموں کا عدم اتفاق اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یومِ شہداء کے بعد بلوچ شہداء کمیٹی کا یہ بیان سامنے آیا ''شہداء سے عقیدت حوصلہ افزاء عمل ہے۔ مزید شعوری جدوجہد جاری رہے گی، آزادی پسند ساتھیوں نے یومِ شہداء کی حمایت میں پس و پیش سے کام لے کر وقت گزاری کی۔ ایسے رویے قابلِ افسوس ہیں جو قومی یکجہتی میں گروہی خیالات کی تقویت کا باعث بنتے ہیں''۔ شہداء کمیٹی کا بیان اپنی جگہ ٹھیک ہی سہی مگر اس سے پہلے بی ایل اے کی جانب سے بیان سامنے آیا تھا کہ تما آزادی پسندوں سے مشاورت کے بعد آپسی اتفاق رائے سے شہداء کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ اب آیا آزادی پسند سیاسی تنظیموں سے رابطہ کرنے کو درخود اعتناء ہی نہیں سمجھا گیا یا انہوں نے خود بے رخی اختیار کی۔۔؟ ہماری ناقص رائے میں تحریک کے اس نازک موڑ پر اس طرح کے اختلافات کو ہوا دینا اور انہیں

میڈیا کی زینت بنانا کسی صورت بھی نیک شگون نہیں خاص طور پر جب آنے والے پاکستانی پارلیمانی انتخابات کو قریب آتا دیکھ کر پارلیمانی گماشتے عوام کو قومی تحریک سے بدظن کرنے کیلئے پوری طرح میدان میں متحرک ہیں اور دشمن آزادی پسندوں کو توڑنے اور انہیں کمزور کرنے کیلئے طرح طرح کے حربے آزمانے کے ساتھ مختلف قسم کے مراعات کا اعلان کررہا ہے۔قومی تحریک میں غلطیوں، کوتاہیوں کی نشاندہی اور مفید مشورے دینا ایک حوصلہ افزاء اور نیک امر ہے مگر اختلافات اور رنجشوں کا سدباب کرنا بھی اشد ضروری ہے ورنہ معمولی اختلافات کو پہلے سے تاک میں بیٹھے دشمن اور کچھ اپنے نادان دوست (لاشعوری طور پر) ہوا دے کر قومی تحریک ویکجہتی کیلئے زہر قاتل ثابت کرتے ہیں۔

دوسری جانب شہید بالاچ ڈے پر ریفرنسز کا انعقاد آزادی پسند سیاسی تنظیموں اور پارٹیوں کی جانب سے بھی زور وشور سے کیا گیا جسکے بعد نوابزادہ حیر بیار مری نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''جو پارٹیاں آج شہید بالاچ مری کا دن منانے جارہی ہیں تو کل تمام شہداء کا الگ الگ دن منائینگے۔۔؟'' یقیناً حیر بیار مری کا تنقید مثبت اور حوصلہ افزاء امر ہے کیونکہ بلوچ شہداء کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ہر ایک شہید الگ الگ دن منانا شاید ممکن نہیں اور اگر چند شہداء کا دن منایا جائے اور باقیوں کو نظر انداز کیا جائے تو وہ انکی قربانی کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔اور اس خیال کی تقویت کا باعث بنے گی کہ بلوچ قومی تحریک میں چند مخصوص خاندانوں یا کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ شہداء کو اہمیت دی جاتی ہے اور دیگر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس ماہ میں قابض ریاست پاکستان کے وزیراعظم نے بلوچ گلزمین پر قدم رکھ کر اور اپنے گماشتوں کے ساتھ رقص، موسیقی اور موج مستی کی محفلیں سجا کر بلوچ قوم کو اسکی غلامی کا احساس دلایا اور یہ شوشہ چھوڑا کہ ناراض قوم پرست (آزادی پسند) جہاں چاہیں مذاکرات کیلئے تیار ہیں۔اب نجانے قابض ریاست کے واکدار سوچنے سمجھنے سے بالکل عاری ہیں یا وہ جان بوجھ کر اس بات کو چھپانے کی کوشش کررہے ہیں کہ آزادی پسندوں نے کبھی بھی مذاکرات کے خواہش کا نہ اظہار کیا ہے اور نہ وہ وہ پاکستان کی خواہش پر کبھی بھی مذاکرات کیلئے تیار ہوئے ہیں۔اپنی انا کی تسکین، وقت گزاری، اپنے لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش یا پھر وہ اپنے مقامی دلالوں کے اس بہکاوے میں آگئے ہیں کہ جو وہ کہتے نہیں تھکتے کہ اگر انکی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے (پاکستان کو یہی سہانا خواب دکھا کر وہ اپنی تنخواہ و مراعات میں روز بہ روز اضافہ کررہے ہیں) تو وہ بلوچ آزادی پسندوں کو آزادی کی جدوجہد سے دستبردار کروا کر انہیں سرزمین کا سودا کرنے اور دائمی غلامی قبول کرنے کیلئے مذاکرات کی میز پر لاسکتے ہیں۔مگر وہ اتنے بھی سادہ نہیں رہے۔اسکا اندازہ پاکستانی وزیراعظم کو اپنے دورہ گوادر کے دوران ہی ہوگیا ہوگا جب بلوچ آزادی پسند سیاسی پارٹیوں کی کال پر بلوچ عوام اور تاجر برادری نے مکران بھر میں ہڑتال کرکے قابض کو یہ واضح پیغام دیا کہ وہ چاہے اپنے گماشتوں اور چمچوں کا کتنا ہی بڑا لشکر پیچھے لگا کر کیوں نہ گھومیں مگر ایک عام بلوچ اپنے سرزمین پر آپکے قدم رکھنے کو بھی گوارہ نہیں کرتا اور اپنی مادر سرزمین پر آپکے وجود کو باعث نفرت سمجھتا ہے۔آپ چاہے اپنے گماشتوں کے ذریعے بلوچستان پاکستان کا اٹوٹ انگ ہے، بلوچستان و پاکستان لازم وملزوم ہیں جیسے لاکھ شوشے کیوں نہ چھوڑیں مگر مہذب دنیا اب آپکے کسی بھی جھوٹے دعوے پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔

وطن کو آزادی کی مئے پلانے کیلئے بلوچ فرزندوں کا تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرنے کا سلسلہ بھی اس مہینے میں جاری رہا۔اطلاعات کے مطابق 22 نومبر کو شہید الیاس نذر کے بڑے بھائی اور تربت کے معروف تاجر نواب جان نذر کو پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے اپنے چند مقامی دلالوں کی مدد سے آپسر سے تربت بازار کی طرف جاتے ہوئے اغواء کرلیا۔

آج تحریک آزادی اور قربانیوں کے تسلسل کی تاریخ تو جذبہ حریت سے سرشار آزادی کے متوالے اپنے خون اور اپنے نازک جسم پر سہے صعوبتوں اور دشمن کی وحشتناک اذیتوں سے لکھ رہے ہیں۔کل اگر کوئی مورخ بلوچ قوم کی قربانیوں کو تاریخ کے پنوں پر رقم کرے یا نہ کرے۔دنیا کی طاقتور میڈیا کی نشریات میں بلوچ قوم پر ڈھائے جانے والے مظالم جگہ حاصل کرپائیں یا نہ پائیں مگر آج بلوچ شہداء کے گرتے لہو کا ہر قطرہ ایک تاریخ رقم کررہا ہے۔آج بلوچ اسیران کے نرم و نازک جسم پر وحشتناک اذیتیں خود تاریخی ثبوت کے طور پر تحریک آزادی کی تاریخ کو بیان کریں گی۔بلوچ حریت پسندوں کو وطن کی آزادی کی بادصباء کی خوشبو تو ٹارچر سیلوں میں آتی ہے، آزادی کے صبح صادق کا طلوع ہوتا سورج انہیں تو اسی تنگ وتاریک کال کوٹھری سے نظر آتا ہے جہاں جذبہ آزادی سے عاری انسانوں کیلئے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں مگر ان قومی غداروں اور انکی آنے والی نسلوں کا مستقبل ابھی سے تاریک ہونا شروع ہوگیا ہے۔چند معمولی مراعات کے عوض اپنا

ضمیر، اپنی غیرت فروخت کرنے والے ان دلالوں کو تو کل مادرِ وطن اپنے سینے پر بھی جگہ نہیں دے گی اور یہ بے ضمیر ایجنٹ رسوائی و بربادی کی زندگی گزارنے کیلئے بہاریوں کی طرح لاوارث پناہ گزین کیمپوں میں پڑے رہیں گے۔

دوسری جانب آزادی کی دلہن بننے والے وطن کے ہاتھوں کو اپنے خون سے سجانے کیلئے شہادتوں کا تسلسل بھی جاری رہا۔ قابض فورسز کے ساتھ جھڑپ میں بی آر پی کے مرکزی ترجمان شیر محمد بگٹی کے جوانسال فرزند حق نواز بگٹی اور پاکستانی ایجنٹوں اور بے ضمیر دلالوں پر مشتمل بلوچ نسل کش ٹولے کے کارندوں کی فائرنگ سے خاران میں اللہ رحم ساسولی اور اسلم ڈگارزئی شہادت کے رتبے پر فائز ہوگئے۔ اطلاعات کے مطابق شہید حق نواز نے قابض فورسز کے کئی اہلکاروں اور شہید اللہ رحم اور اسلم ڈگارزئی نے دو قومی غداروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہزار سلام گلزمین کے ان لاڈلوں کو جو قوم کے مستقبل کے چراغ کو اپنے پاک لہو سے روشن کررہے ہیں۔ شہید اللہ رحم جسکی دلہن ہاتھوں میں مہندی سجائے اپنے دلہے کا انتظار کررہی تھی مگر اللہ رحم تو آزادی کے دلہن کی ہاتھوں کو اپنے لہو سے سجا کر تاریخ میں امر ہوگیا۔

تجدید عہد کا دن جدوجہد و عمل، غور و فکر اور قربانیوں کے تسلسل کی ایک طویل فہرست۔ بی ایس او کا یومِ تاسیس بھی اسی مہینے میں منایا گیا۔ بی ایس او (آزاد) کی جانب سے بی ایس او کے 45ویں یومِ تاسیس کے موقع پر انقلابی طریقہِ کار پر تمام زونوں میں تربیتی ورکشاپس منعقد کیئے گئے اور انقلابی عمل اور جدوجہد کے تسلسل کو جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔ بلاشبہ بلوچ قومی تحریک میں بی ایس او کے قربانیوں کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے لیڈران کی دشمن سے سازباز کرنا اور نیپ کی قوم پرستی کے نام پر دوغلی سیاست۔ قوم کی سیاسی و انقلابی تربیت کیلئے قومی تحریک میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے بی ایس او نے ہی پُر کیا۔ بی ایس او نے ہزاروں ایسے انقلابی و نظریاتی کامریڈز کی پرورش کی ہے جنہوں نے قومی تحریک میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا یا پھر آج بھی جدوجہد کے کاروان کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ گوکہ دشمن اور گماشتوں کی ریشہ دوانیوں سے بی ایس او کئی مرتبہ تقسیم کا شکار ہوکر پارلیمانی پارٹیوں کی پاکٹ آرگنائزیشن کا کردار ادا کیا مگر حقیقی لیڈران کی واضح سمت، وژن اور جدوجہد سے بی ایس او، بی ایس او (آزاد) کی شکل میں آج پھر بلوچ قومی تحریک میں ایک مضبوط ادارے کی صورت میں موجود ہے اور ایک طلباء تنظیم ہوتے ہوئے بھی ماس پارٹی کا کردار ادا کررہی ہے۔ گوکہ بی ایس او کے پلیٹ فارم پر سیاست کرنے والے کئی کمزور ارادوں کے مالک حضرات دم ہلاتا کتا بن کر (معازرت کے ساتھ) دشمن کے چرپ نوالے کی طرف لپکے مگر بی ایس او کے حقیقی جہدکار اور پختہ عزم کے مالک کیڈرز آج بھی میدان میں موجود ہیں۔ ایک مضبوط انقلابی ماس پارٹی کی عدم موجودگی میں بی ایس او نے اپنے قیام سے لے کر آج تک ایک حد تک اس خلاء کو پر کیا ہے اور آج بھی ماس پارٹی کی کمی کی وجہ سے بی ایس او (آزاد) نے اس میدان میں جدوجہد کو جاری رکھا ہے۔ بی این ایم اور بی آر پی کی جدوجہد سے کوئی ذی شعور شخص انکار نہیں کرسکتا مگر ہماری ناقص رائے میں (اگر نظریاتی دوست برا نہ مانیں) مذکورہ پارٹیاں عوام کو موبلائز کرنے میں وہ نتائج نہیں دے سکی ہیں جو ایک ماس پارٹی کو دینا چاہیئے۔ اسی لیئے بی ایس او جسکی ذمہ داری یوتھ و اسٹوڈنٹس کی تربیت کرکے انہیں ایک پروڈکٹ کی صورت میں تیار کرکے آگے بھیجنا ہے اپنے تاریخی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے عام عوام کی تربیت کا ذمہ بھی اپنے کندھوں پر لیا ہوا ہے اور دیگر آزادی پسند سیاسی پارٹیوں کی نسبت زیادہ فعال کردار ادا کررہی ہے۔ آج بلوچ عوام کو دیگر کسی بھی سیاسی پارٹی کی نسبت بی ایس او سے زیادہ توقعات وابستہ ہیں۔ بی این ایم اور بی آر پی کی جدوجہد بھی قابلِ تعریف۔ بعض نظریاتی دوست بی ایس او سے اسکے ایک اسٹوڈنٹ تنظیم ہونے کے ناطے اپنی حدود پھلانگ کر ماس پارٹی کے فیصلے کرنے کا گلہ کرتے ہیں۔ مگر یہ سوال کہ کیا بی ایس او 45 سال سے یوتھ و اسٹوڈنٹس کے ساتھ ساتھ عام عوام کی تربیت نہ کرتی تو کیا ماس پارٹی کی عدم موجودگی میں پارلیمانی زرخرید عوام کو پارلیمانی سیاست کے دلدل میں نہ پھنساتے۔ اور آج بھی اگر آزادی پسند سیاسی پارٹیاں اس خلاء کو پُر نہیں کرسکی ہیں تو بی ایس او کا اس خلاء کو پر کرنا زیادہ سودمند ہے یا اس خلاء کو پارلیمانی پارٹیوں کیلئے خالی ہی چھوڑ دینا بہتر ہے تاکہ وہ ایک مرتبہ بلوچ عوام کو گمراہ کرکے اپنے جال میں پھنسائیں۔ اگر کوئی اور ماس پارٹی کا کردار ادا نہ کر سکے تو بی ایس او یہ کام نہ کرے تو کیا کرے۔۔۔۔۔۔؟

ماہِ نومبر میں بی ایس او(آزاد) اور بی این ایف کے خباری بیانات

ادارہ

تاریخ:01نومبر2012

آزادی کی جدوجھد بلوچوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ھے ۔(بی ایس او(آزاد)

بلوچ اسٹوڈنس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ عید کے روز قابض ریاست کے خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے تین بلوچ فرزندان زاہد ولد ہیپتان ،عمر ولد ہیپتان ،فدا ولد احمد کو اغواہ کیا واضح رہے کہ زاہد ولد ہیپتان تین سالوں سے دبئی میں مزدوری کررہے تھے بروز اتوار 28 اکتوبر کو عید کے چھٹیاں گزارنے کیلئے بذریعہ طیارہ شارجہ سے تربت آرہے تھے اور ان کے بھائی عمر ولد ہیپتان فدا ولد احمد انہیں اہر پورٹ سے وصول کرنے گئے تھے واپسی پر ریاستی سیکورٹی فورسز اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے قریبی چیک پوسٹ سے اغواہ کرکے اپنے ساتھ لے گئے ۔

ترجمان نے مزید کہا کہ ریاستی ادارے اپنی شکست دیکھ کر جارحیت میں تیزی لاچکے ہیں بلوچ فرزندوں کی قربانیوں اور جدوجہد نے قابض کو گھٹنے ٹھیکنے پر مجبور کردیا ہے بلوچ ماؤں اور بہنوں کی حوصلے نے ریاستی بربریت کو پسپا کردیا ہے بلوچ قومی تحریک کے منظم جدوجہد عالمی حمایت اور اقوام متحدہ کے بلوچستان کے حوالے پیش رفت کے بعد قابض ریاست شدید خوف میں مبتلا ہوچکا ہے قابض نے مقبوضہ بلوچستان میں اپنے الیکشن منعقد کرانے کیلئے اپنے سیکورٹی فورسز ،خفیہ اداروں اور زرخرید قاتل گروں کی بلوچستان بھر میں جاری سفاکیت کو مزید تیز کردیا ہے اس اثنا میں بلوچوں کو لاپتہ کرنے اور ان کی لاشوں کو پھیکنے کے سلسلے کو مزید تیز کردیا ہے عید کے روز 3 بلوچ فرزندوں کو اغواہ جبکہ گزشتہ ایک مہینے کے دوران متعدد بلوچوں کا جبری گمشدگی جاری بربریت کا تسلسل ہے جوکہ عالمی اداروں کو پیغام دے رہے ہیں پاکستان نے اپنے تاریخ میں کبھی بھی عالمی اداروں اور عالمی دنیا کے امن کو خاطر میں نہیں لایا ہے جس کے واضع مثالیں پاکستان کی جانب سے دنیا کے دہشت پسند قوتوں کی سرپرستی اور دنیا کو مسلسل دھوکہ دینے کے مسلسل واقعات ہیں ۔

بلوچ قومی تحریک کے مقبولیت اور عوامی حمایت کے بعد قابض نے اپنے پیدا کردہ گماشتوں کو بلوچ قومی تحریک کیخلاف متحرک کردیا ہے بلوچستا میں اپنے ناکامی اور شکست کا چھپانے کیلئے اپنے گماشتوں کو جدید قسم کے وسائل اور طاقت فراہم کرکے بلوچستان بھر میں جاری ریاستی بربریت کو ایک مرتبہ پھر تیز کردیا گیا ہے جس طرح دنیا بھر کے مسلمان عید کو مذہبی تہوار کے طور پر بھرپور خوشی سے مناتے ہیں لیکن مقبوضہ بلوچستان میں نام نہاد اسلامی ریاست نے گزشتہ عیدوں کی طرح اس عید پر بھی بلوچ فرزندوں کو اغواہ کیا قابض اور اُس کے گماشتوں کی ظلم و بربریت بلوچ فرزندوں کو اپنی عظیم قومی مقصد سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا سکتا ہے ۔

آزادی کیلئے جدوجہد بلوچوں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے لاپتہ بلوچوں کے اہلخانہ نے عید کے روز احتجاج میں گزار کر دنیا کو پیغام دیا ہے کہ بلوچ قوم اپنی قومی آزادی کے جدوجہد کیلئے قربانی کے جذبوں سے سرشار ہے اپنے عظیم قومی مقصد کیلئے ہر قسم کے ظلم وجبر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے ۔

بلوچ شہداوں اور جہدکاروں کا مقصد ایک آزاد اور خوشحال بلوچستان ہے ہم اپنے شہداوں اور جہدکاروں کی قربانیوں سے عہد کرتے ہیں کہ اپنے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کے قربانی دینے کو تیار ہے اپنے وطن سے قابض کے وجود کو ختم کرکے ایک آزاد پُر امن اور خوشحال وطن کو حاصل کرکے ہی دم لے گے ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ02نومبر2012

پاکستان سے مطالبہ کرنے کے بجائے عالمی برادری ایران کی طرح پاکستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کرے۔(بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا ہے کہ امریکہ کی طرف سے بلوچستان کے مسئلے پر اقوام متحدہ جیسے ادارے میں آواز اٹھانہ ایک خوش آئند عمل ہے لیکن امریکہ سمیت عالمی ادارے پاکستان کی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے پاکستان سے کاروائی کا مطالبہ کرنے کے بجائے برائے راست پاکستان کے خلاف کاروائی کریں۔

جنیوا میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کے جائزہ اجلاس میں امریکہ کی جانب سے بلوچستان میں پاکستان کی بڑھتی ہوئی تشدد، سیاسی کارکنوں سمیت عام بلوچوں کو لاپتہ اور شہید کرنے پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور پاکستان کو کھڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا امریکی مندوب کی جانب سے بلوچستان میں پاکستان کے ہاتھوں کشت وخون کو تنقید کا نشانہ بنانا ایک خوش آئندہ عمل ہے لیکن امریکہ کی پاکستان پر معظ تنقید پاکستان کو تشدد اور عالمی قوانین کی خلاف ورزیوں سے نہیں روک سکتی کیونکہ آج اقوام متحدہ، یورپی یونین اور دیگر انسانی حقوق کے علمبرداروں کی موجودگی اور ان کے خدشات کے باوجود بلوچستان میں پاکستانی ادارے عالمی قوانین کو پامال کر کے بین الاقوامی اداروں کا مزاق اڈھا رہے ہیں جس کی واضع مثال اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ کا بلوچستان کا دورہ ہے جسے پاکستان نے عملاً یکسر رد کرتے ہوئے پہلے سے جاری جبری گمشدگیوں اور لاشیں پھینکنے کے عمل کو تیز کر دیا ہے جس کے بعد اب کسی بھی طرح پاکستان سے عالمی دنیا کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ صرف تنقید اور چند تجاویز کو مان کر ان پر عمل درآمد کریگا جبکہ جس طرح اس سے پہلے ہونے والی تنقیدوں اور عالمی سطع پر اٹھنے والی آوازوں کے بعد پاکستان نے اپنا جبر مزید تیز کر دیا ہے اب اقوام متحدہ میں امریکہ کی جانب سے آواز اٹھائے جانے کے بعد بھی اسی طرح بلوچ نسل کشی کے کاروائیوں کو مزید تیز کر دیگا جبکہ امریکہ کی جانب سے پاکستان پر مسلسل تنقیدوں اور پاکستان کی عالمی دنیا کو چیلنج کرنے کے باوجود پاکستان پر اقتصادی پابندی عائد نہیں کی جارہی اور پاکستان تا حال عالمی امداد حاصل کر رہا ہے جسے وہ کھلے عام بلوچ قومی تحریک آزادی کو دبانے کیلئے استعمال کر رہا ہے جو کہ امریکہ سمیت عالمی اداروں کی کارکردگی پر ایک سوالیہ نشان ہے عالمی اداروں میں مسلسل اٹھائے جانے والے خدشات اور مطالبات اور پاکستان کی جانب سے عالمی قوانین کی پابندی نہ کرنے کے بعد بین الاقوامی برادری ایران پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی طرح پاکستان پر بھی اقتصادی پابندیاں عائد کر کے بلوچ تحریک آزادی کی حمایت کرے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ05نومبر2012

قانوں کے عملداری کے نام پر ھالیند کی جانب سے امداد،جاری بلوچ نسل کشی کیلئے استعمال کیا جائیگا۔

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) کے مرکزی ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ ہالینڈ حکومت کی جانب سے مقبوضہ بلوچستان میں پولیس کو جراہم کے خاتمے اور قانون کے عملداری کے نام پر دیئے جانے والے 2.5 ملین ڈالر امداد ایک تشویش ناک بات ہے یہ امداد براہ راست پاکستان کی جانب سے جاری بلوچ نسل کشی میں استعمال ہونگے بلوچستان میں پاکستانی خفیہ ادارے اور پولیس برائے راست بلوچ تحریک آزادی کو دبانے کیلئے جراہم پیشہ اداروں کی سراپرستی کر رہے ہیں بلوچستان میں جاری جبری گمشدگیاں، مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی، سول آبادیوں پر بمباری اور عالمی قوانین کی سنگین خلاف ورزیوں میں شدت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں انتظامیہ، خفیہ اداروں اور سیکورٹی فورسز کی انسانی حقوق کے حوالے سے کاردگی پوری دنیا کیلئے تشویش کا باعث ہے اس صورتحال میں پاکستان کو عالمی امداد کی

فراہمی عالمی دنیا کے انسانی حقوق کے حوالے سے دعوں پر سوالیہ نشان ہے پاکستانی خفیہ ادارے اس وقت بھی نیٹو اور امریکہ سے ملنے والے امداد کو بلوچوں ے خلاف استعمال کررہے ہیں حالانکہ بین الاقوامی اداروں کی رپورٹیں یہ واضع کرچکی ہیں کہ بلوچستان میں پاکستانی خفیہ ادارے اور پولیس برائے راست بلوچ تحریک آزادی کو دبانے کیلئے جراہم پیشہ عناصر کی سرپرستی کررہے ہیں اسی طرع اب ہالینڈ کی جانب سے ملنے والی امداد کو بھی جرائم پیشہ عناصر کا نام لیکر بلوچ نسل کشی کیلئے استعمال کیا جائیگا انسانی حقوق کی سنگین پامالیوں کے روک تھام اور خطے میں قیام امن کیلئے عالمی برادری کو پاکستان کے حوالے اپنی پالیسوں پر نظر ثانی کرنا ہوگا کیونکہ عالمی برادری کے تعاوان اور امداد لیکر پاکستان پورے خطے میں دہشت پسند قوتوں کے سرپرستی کررہا ہے جس سے پوری دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے۔

ترجمان نے مزید کہا کہ پاکستان بلوچستان میں اپنی شکست چھپانے کیلئے عام آبادیوں پر بمباری کررہا ہے اور مختلف علاقوں میں خوف وہراس پہلایا جارہا ہے گزشتہ دنوں کوہلو میں فضل چیل، کوہ سنٹ اور میوند کے علاقوں میں جیٹ طیاروں کے ذریعے بمباری کی گئی جبکہ پروم کے علاقے رحیم آباد میں گزشتہ روز ایف سی کے اہلکاروں نے علاقے کو محاصرے میں رکھ کر علاقے میں خوف وہراس پہلایا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ؛06 نومبر 2012

ایف سی ذریعے راشن تقسیم جعلی الیکشن مھم کا حصہ ھے۔(بی ایس او آزاد)

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ تمپ میں ایف سی کے اہلکار گھر گھر جا کر راشن تقسیم کرنے کے بہانے لوگوں کے بارے میں اعداد وشمار اکھٹا کررہے ہیں جس کا مقصد لوگوں اور علاقے کے بارے میں معلومات اکھٹا کر کے جعلی الیکشن ممکن بنانا ہے بلوچ عوام سے گزارش ہے کہ وہ ایف سی اور پاکستانی کسی بھی ادارے سے تعاون کرنے اور انہیں کسی بھی قسم کی معلومات اور اعداد وشمار دینے سے گریز کریں کیونکہ ایف سی اور خفیہ ایجنسیاں انہی معلومات کو بلوچ عوام کے خلاف استعمال کرتے ہوئے انہیں نقصان پہنچارہے ہیں پاکستان اپنی شکست کو چھپانے کیلئے بلوچستان میں الیکشن ممکن بنانے کی کوشش کررہا ہے لیکن اپنی فوج اور خفیہ اداروں کی شکست خوردگی اور قوم پرستوں کے بیس میں اپنے گماشتہ سیاستدانوں کے بے نقاب ہونے کی صورت میں اب ایف سی کے ذریعے عوام میں راشن تقسیم کرنے اور امدادی کام کرنے کے بہانے لوگوں کے بارے میں معلومات اکھٹا کررہے ہیں جن کے بنیاد پر بلوچستان میں الیکشن کا ڈرامہ رچا کر پاکستان عالمی دنیا کے سامنے اپنی شکست کو چھپانے کی کوشش کررہا ہے لیکن ان حربوں سے پاکستان بلوچستان میں اپنے قبضہ کے خاتمہ کو نہیں روک سکتا بلوچ عوام اب باشعور ہو چکی ہے اور اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو نہیں بھول سکتے تمپ کے علاقے میں ہی اسی ایف سی نے حملہ کر کے مختار بلوچ کو شہید اور بانک شہناز بی بی سمیت متعدد افراد زخمی کیا جبکہ سینکڑوں بلوچ فرزندوں کی مسخ شدہ لاشیں وصول کرنے اور ہزاروں کے اغواء کے بعد بلوچ قوم ایف سی اور دیگر پاکستانی اداروں کی عمدرویوں اور امداد دینے کے جانسوں میں نہیں آہینگے بلوچ قوم نے ہمیشہ بھوکا رہنا گوارہ کیا ہے مگر اپنے دشمن سے کبھی بھی خیرات نہیں لی ہے بلوچ فرزندوں کی قربانیوں اور منظّم جدوجہد کے نتیجے میں بلوچ قومی تحریک کامیابی کے مراحل طے کرتی ہوئی منزل مقصود کی جانب بڑھ رہی ہے جس سے قابض بوکھلاہٹ کا شکار ہوکر قومی تحریک کا راستہ روکنے کیلئے مختلف ہتھکنڈے آزمارہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ 7 نومبر 2012

13 نومبر کو یوم شھداء کے موقع پر تمام زونوں پر ریفرنسز منعقد کیئے جائینگے۔۔بی ایس او (آزاد)

بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (آزاد) کے مرکزی ترجمان نے بلوچ قومی فوج بی ایل اے کی جانب سے 13 نومبر کو ''یومِ شہداء آزادی'' کے طور پر منانے کے اعلان کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ 13 نومبر کو ''یومِ شہدائے آزادی'' کے طور پر بھرپور انداز میں منا کر آزادی کیلئے جان قربان کرنے والے شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا جائیگا لہذا بی ایس او آزاد کے تمام زونوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ ہزاروں معلوم اور گمنام عظیم شہداء کی یاد میں بلوچستان اور بین الاقوامی سطح پر انقلابی طریقہ کار پر کاربند رہتے ہوئے ریفرینسز اور پروگرامز کا انعقاد کر کے شہداء کی عظیم قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کریں۔ترجمان نے کہا کہ 13 نومبر 1839 کو نواب مہراب خان اور ان کے ساتھیوں نے انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا اور قبضہ گیر قوتوں کے خلاف اپنی آزادی کیلئے قربانی دیکر بلوچ قومی تاریخ میں آزادی کیلئے شہادتوں کے ایک باب کی ابتداء کی جس کے تسلسل میں ہزاروں بلوچوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کیلئے جدوجہد کر کے شہادت قبول کی اور اسی حریت اور جزبہ آزادی کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور بلوچ سرزمین پر پاکستانی قبضے کے خلاف بلوچ قومی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھتے ہوئے نواب اکبر خان، بالاچ مری، ڈاکٹر خالد، غلام محمد بلوچ سمیت ہزاروں بلوچ فرزند اب تک شہادت کے رتبے پر فائز ہو چکے ہیں جس کا تسلسل بلوچ قوم کی آزادی تک جاری رہے گا۔اب تک ہزاروں بلوچ آزادی کیلئے اپنی جانیں نچاور کر چکے ہیں جن کی قربانیوں کے بدولت آج بلوچ قوم پوری دنیا میں اپنے وجود کو منوا چکی ہے اور بلوچ قومی آزادی کی جدوجہد عالمی سطح پر متعارف ہو چکی ہے آزادی کیلئے جان نچھاور کرنے والوں میں کئی ایسے گمنام شہید بھی شامل ہیں جنہیں نامعلوم مقامات پر شہید کر کے ان کی لاشوں کو غائب کر دیا گیا ہے۔نواب مہراب خان کی جدوجہد اور قربانیوں کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے آج بلوچ قوم اپنی آزادی کیلئے جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں ۔13 نومبر کو ''یومِ شہداء آزادی'' کے دن کے طور پر منا کر خان مہراب خان سے لیکر بلوچستان کی آزادی کیلئے شہید ہونے والے ہزاروں معلوم اور گمنام شہیدوں کے مقصد کو جاری رکھنے کا عزم کیا جائیگا اور ان کی بے مثال جدہ جہد اور قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کیا جائیگا ترجمان نے کہا کہ 13 نومبر کو تمام زون انقلابی طریقہ کار پر کاربند رہتے ہوئے شہداء بلوچستان کی یاد میں ریفرینسز اور پروگرامز کا انعقاد کر کے ان عظیم شہداء کو خراج عقیدت پیش کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:12 نومبر 2012

تمام آزادی پسند تنظیموں کا 13 نومبر کو یوم شھدا منا نا ایک مثبت قدم ھے۔۔۔بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان نے اپنے بیان میں کہا کہ 13 نومبر کو شہدا کے دن کے مناسبت سے بی ایس او آزاد کی جانب سے منایا جائیگا اور ریفرنسز کا انعقاد کیا جائیگا۔13 نومبر کو بلوچستان سمیت دنیا بھر میں بسنے والے بلوچ قومی آزادی کیلئے جانوں کا نظرانہ پیش کرنے والے شہدا کے عظیم قربانیوں کو یاد کرنے کیلئے بھرپور انداز میں منائینگے اور شہدا کی یاد میں ریفرنسز منعقد کی جائینگی،13 نومبر کو بی ایس او آزاد کی جانب سے آزادی کیلئے اپنی جانوں کا نزرانہ پیش کرنے والے شہیدوں کی یاد میں شہدا کا قومی دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا جس کی مناسبت سے ہر سال بلوچستان بھر میں اور بلوچستان سے باہر رہنے والے بلوچ آزادی کے لئے شہید ہونے والوں کا دن مناتے ہیں اسی طرح اس مرتبہ بھی 13 نومبر کو شہدا کو یاد کرتے ہوئے شہدا کا قومی دن بھرپور انداز میں منایا جائیگا۔ترجمان نے مزید کہا کہ دیگر آزادی پسند تنظیموں کی جانب سے بھی 13 نومبر کو یوم شہدا منانا ایک مثبت قدم ہے جبکہ بی ایس او آزاد کی جانب سے شہدا کے یاد میں تمام زونوں میں ریفرنسز کا انعقاد

کیا جائیگا۔اور تمام زون انقلابی طریقہ کار کے مطابق ریفرنسز کریں، بلوچ شہدا نے اتنک جدوجہد اور بے مثال قربانیوں سے بلوچ قومی تحریک آزادی کو ناقابل شکست بنا دی ہے۔آج بلوچ قوم آزادی کی جدوجہد کے اس تاریخی مرحلے پر آزادی کیلئے شہید ہونے والے فرزندوں قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے ان کے جدوجہد کے تسلسل کو جاری رکھنے سے ہی ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:15 نومبر 2012

شھید حق نواز نے محاذ پرجان کا نزرانہ پیش کر کے جھد آزادی کی شمع کو روشن رکھا ۔ بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان کی نے اپنے جاری کردہ بیان میں بلوچ سرمچار شہید حق نواز بگٹی کو سرخ سلام پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہید حق نواز نے محاذ پر جان کا نزرانہ پیش کر کے جہد آزادی کی شمع کو روشن رکھا شہید کی جدوجہد اور قربانی کو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا بلوچ قومی تحریک شہید حق نواز اور ان جیسے ہزاروں شہیدوں کے قربانیوں کے بدولت ہی کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے شہدا کی جدوجہد اور قربانیوں کے تسلسل کو آزادی کے حصول تک جاری رکھا جائیگا۔گزشتہ روز شہد حق نواز بگٹی نوشکی میں پاکستانی فوج کے ساتھ دوران جنگ شہادت نوش کر گئے جنہوں نے دشمن کے سامنے ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے بلوچ قومی تاریخ شہید حق نواز جیسے بہادر فرزندوں کی قربانیوں سے روشن ہے جنہوں نے اپنی وطن کی حفاظت اور اپنے قوم کی آزادی کیلئے ہمیشہ قبضہ گیروں اور سامراجی طاقتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنے پیچھے ایک عظیم جدوجہد اور اپنی قربانیوں کی تاریخ چھوڑ گئے شہدا کی قربانیوں کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے ہی ہم آزادی جیسے عظیم مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:16 نومبر 2012

مشکے اور گرد و نواح میں بھت بڑے آپریشن کی تیاریاں کی جارھی ھیں۔بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان کی جانب سے جاری کردہ بیان میں کہا کہ مشکے اور گردونواح میں بہت بڑے آپریشن کی تیاریاں کی جارہی ہیں فورسز کی باری نفری اور گن شپ ہیلی کاپٹر پہنچ چکی ہیں۔خضدار اور سوراب میں گن شپ ہیلی کاپٹرز اور فورسز کی باری نفری پہنچ چکی ہے جس سے مشکے اور گردونواح کے علاقوں میں ایک بہت بڑے خونی آپریشن کی تیاریاں کی جارہی ہیں بلوچ عوام دشمن کی کسی بھی کاروائی کے خلاف پہلے سے تیار رہ کر سخت سے سخت ردعمل کا مظاہرہ کریں۔بلوچستان میں پاکستانی فورسز اپنی پے در پے ناکامیوں کو چھپانے کیلئے مسلسل مقامی آبادی کو نشانہ بنا رہے ہیں جبکہ اپنی تمام حربوں کی ناکامی کے بعد اب پاکستانی فورسز اور خفیہ اداروں نے بلوچستان بھر میں نسل کشی اور قتل عام میں اضافہ کیا ہے مشکے اور گردونواح میں کاروائی کی تیاریاں اسی کا تسلسل ہیں لیکن بلوچ عوام ہر قسم کی جارحیت کا سامنہ کرنے کیلئے تیار ہیں پاکستان کی جانب سے کسی بھی طرع کی جارحیت ناکامی کا شکار ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:19 نومبر 2012

شھید بالاچ مری کی فکر اور جد و جھد بلوچ عوام کیلئے مشعل راہ ھے۔بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر) شہید بالاچ مری کی برسی کی مناسبت سے بی ایس او آزاد کے تمام زونوں میں ریفرنسز کا انعقاد کیا جائیگا بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ شہید بالاچ مری کی برسی کی مناسبت سے بی ایس او آزاد کے تمام زونوں میں ریفرنسز کا انعقاد کیا جائیگا ترجمان نے مزید کہا کہ شہید بالاچ مری کی فکر اور جد و جہد بلوچ عوام کیلئے مشعل راہ ہے جس ہر عمل کرتے ہوئے آج ہزاروں کی تعداد میں نوجوان انقلابی نظریہ سے لیس ہوکر میدان عمل میں قومی آزاد اور انقلاب کیلئے جد و جہد کررہے ہیں جبکہ ہزاروں پاکستانی عقوبت خانوں میں ثابت قدمی سے اذیتیں برداشت کررہے ہیں آج شہید بالاچ مری جیسی عظیم انقلابی رہنماوں کی بدولت بلوچ تحریک آزادی کامیابی سے منزل کی طرف گامزن ہے پاکستان اپنی تمام تر عیاریوں اور ظلم وستم کے باوجود بھی بلوچ عوام کو تحریک آزادی سے دور نہیں کرسکتی کیونکہ بلوچ عوام کی سوچ وفکر شہید بالاچ مری جیسے انقلابی رہنماوں کی جد و جہد اور قربانیوں کی دین ہے شہید بالاچ سمیت ہزاروں شہدا کی جد و جہد آج بلوچ عوام کی دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے شہدا کے دن پر دنیا بھر کے بلوچ عوام نے شہدا کے یاد میں پروگرام منعقد کرکے یہ ثابت کردیا کہ بلوچ عوام اپنے شہیدوں کے نقش قدم پر اور ان کے سوچ وفکر پر قائم ہے اور آزادی کیلئے جد و جہد اسی جذبے سے منزل تک پہنچائینگے جس جذبے سے شہدا نے جد و جہد کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نزرانہ پیش کیا شہید بالاچ مری کی شہادت کے دن کے مناسبت سے 19 نومبر کو بی ایس او آزاد کے تمام زون ریفرنسز کا انعقاد کرینگے اور شہید بالاچ کی جد و جہد اور قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے ان کی فکر وعمل کو منزل تک لیجانے کا عزم کرینگے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ: 20 نومبر 2012

شھیدبالاچ محکوم اقوام کیلئے جد و جھد کی مثال بن چکے ھیں۔ بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی کال پر شہید بالاچ مری کی پانچویں برسی کے مناسبت کوئٹہ، کراچی، تربت، پنجگور، خاران، بسیمہ، مستونگ، قلات، منگوچر، کردگاپ، مچھ سمیت دیگر زونوں میں ریفرنسز کا انعقاد کیا گیا ریفرنسز سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے شہید بالاچ مری کی قربانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہید بالاچ مری نے زندگی کی تمام تر عیش وعشرت اور مراعات کو ٹھوکر مار کر بلوچ قومی آزادی کے کاروان کو منزل مقصود تک پہنچانے کیلئے سنگلاخ پہاڑوں کو اپنا مسکن بنایا اور یہ ثابت کردیا کہ جذبہ حریت کے سامنے وقتی آسائشوں اور مراعات کی کوئی وقعت نہیں دنیا میں ایسے کم ہی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنا آج قوم کے مستقبل اور قومی تشخص کی بحالی کیلئے قربان کرکے اپنے قوم کے دلوں میں اپنے آپ کو امر کردیا ہے موت ہر انسان کیلئے برحق ہے مگر وہ موت جو کسی عظیم مقصد کیلئے آئے وہ انسان کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچا کر اسکے مقصد ،فکر وفلسفے کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے اسی طرح شہید بالاچ مری بھی اپنی زندگی قوم ووطن کی خاطر قربان کرکے نہ صرف بلوچ قوم کے دلوں پر راج کررہے ہیں بلکہ وہ دنیا کی دیگر محکوم اور استحصال کی چکی میں پسے اقوام کیلئے بھی جد و جہد کی مثال بن چکے ہیں شہید انقلاب بالاچ مری نے قابض پاکستان کے مظالم اور اسکے فورسز کے سامنے سینہ سپر ہوکر بالاچ گورگیج کی تاریخ کو زندہ رکھا اور پوری دنیا پر یہ بات واضح کردی کہ ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف میدان کارزار میں اترنا ہی انسانیت کا شیوہ اور آزادی کا فلسفہ ہے شہید بالاچ مری نے پاکستانی پارلیمنٹ کو ٹشو پیپر سے تشبیہ دیا اور اسے ٹھوکر مار کے بلوچ قوم کو ووٹ اور الیکشن کا راستہ دکھانے والے پاکستانی گماشتوں کا پول کھول دیا جو پاکستانی پارلیمنٹ کو نجات کا ذریعہ قرار دے کر دراصل اپنے لیئے مراعات کے حصول کی تگ ودود میں مصروف ہیں اور بلوچ قوم کو پاکستانی الیکشن جیسے گناونے حربے میں پانس کرانہیں آزادی جیسے عظیم مقصد سے دور لیجانا چاہتے ہیں ریفرنس سے مقررین نے خطاب کرتے ہوئے مزید کہا کہ بالاچ مری نے اپنے مادی مفادات کو ترجیح دینے کے بجائے اپنی زندگی قومی وانقلابی مقصد کیلئے وقف کردیا آج بالاچ کا فکر وفلسفہ ہر ایک بلوچ کے دل میں زندہ ہے بالاچ آج بھی بلوچ سرمچاروں کی شکل میں وطن کے سرمئی پہاڑوں پر مورچہ زن دشمنوں کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہے بالاچ ایک فرد نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک عظیم فکر وفلسفے وسوچ کا نام ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ: 22نومبر2012

آزادی پسند جماعتوں کے نام پر ھڑتال کی جعلی کال سے کوئی تعلق نھیں۔بی این ایف

کوئٹہ(پ ر)بلوچ نیشنل فرنٹ کے ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ آزادی پسند جماعتوں کے نام پر ہڑتال کی جعلی کال دے کر پاکستانی زرخرید گرؤ بلوچ عوام میں آزادی پسند جماعتوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔گزشتہ روز تربت اور گوادر میں آزادی پسند جماعتوں کے نام پر بزریعہ ایس ایم ایس نیوز ہڑتال کی جعلی کال دی گئی تھی اور بندوک کے زور پر عوام کو ڈرادھمکا کر دکانیں بند کرائی گئی جس کا مقصد عوام میں آزادی پسندوں کے خلاف ہمدردی کے جذبات کو ختم کرنا ہے۔آزادی پسندوں کی جانب سے ہڑتال کی کال باقاعدہ طور پر اخبارات اور میڈیا میں جاری کی جاتی ہے جس کے بعد ایس ایم ایس نیوز میں چلائی جاتی ہیں جبکہ ایس ایم ایس نیوز پر ہڑتال کی جعلی کالوں سے آزادی پسند جماعتوں کا کوئی تعلق نہیں پاکستانی زرخرید گروآزادی پسندوں کے نام پر ایس ایم ایس نیوز چلا کر ہڑتال کی جعلی کال دیتے ہیں جن کا مقصد عوام میں آزادی پسندوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا اور آزادی پسندوں کو حاصل عوامی حمایت کو ختم کرنا ہے۔بلوچ عوام ریاستی گروں کی جانب سے پہلائی جانے والی منفی ہتکھنڈوں کو ناکام بناتے ہوئے کسی بھی جعلی ہڑتال کی کال کو ناکام بنائیں ترجمان نے مزید کہا کہ بلوچ عوام آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور عوامی حمایت کے ذریعے ہی آزادی کی عظیم منزل حاصل کی جاسکتی ہے پاکستان اور اس کے زرخرید گرؤ آزادی پسندوں کو حاصل عوامی حمایت کو ختم کرنے کیلئے مختلف حربے آزمارہے ہیں تاکہ عوام میں آزادی پسند جماعتوں ک خلاف نفرت پیدا کی جاسکے لیکن تحریک آزادی میں عوامی حمایت ہزاروں جہدکاروں اور شہدا اور اسیران کی جدوجہد اور قربانیوں کا نتیجہ ہے جسے کسی بھی طرع ختم نہیں کیا جاسکتا بلوچ عوام اپنے منزل کا تعین کرچکے ہیں جوکہ پاکستان کی قبضہ گیریت سے آزادی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:24نومبر2012

بی ایس او کے پینتالیسویں یوم تاسیس پر ورکشاپ اور تربیتی پروگرام منعقد کیئے جائینگے۔۔۔بی ایس او(آزاد)

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے مرکزی ترجمان کے اپنے جاری کردہ بیان کے مطابق 26 نومبر کو بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے پینتالیسویں یوم تاسیس پر بی ایس او آزاد کے تمام زونوں میں ورکشاپ اور تربیتی پروگرام منعقد کیئے جائینگے یوم تاسیس کے مناسبت سے بی ایس او کی تاریخی جدوجہد اور تحریک آزادی میں تنظیم کاری کی اہمیت اور انقلابی تنظیم کاری کے متعلق تربیتی پروگرام منعقد کی جائینگی ترجمان نے کہا کہ تحریک آزادی میں تنظیم کاری بنیادی اہمت رکھتا ہے بلوچ قوم کو انقلابی بنیادوں پر منظّم اور باشعور کرکے ہی ہم قبضہ گیرے پاکستان کے خلاف آزادی کے پرکھٹن جدوجہد کو منزل تک پہنچا کر انقلابی بنیادوں پر ایک خوشحال اور آزاد سماج کی تشکیل کرسکتے ہیں ایک انقلابی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے عوام کی سیاسی تربیت اور انقلابی تنظیم کاری بنیادی اہیت رکھتا ہے اور ہم یہ تب ہی حاصل کرسکتے ہیں جب ہمارے پاس انقلابی تنظیم اور انقلابی کارکن ہوں جوکہ اپنے سماج میں موجود غلامانہ نفسیات اور پاکستان کے شاطر حربوں کا مقابلہ کرسکیں آج اگر بلوچ قومی تحریک کامیابی سے منزل کی جانب گامزن ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ انقلابی تنظیموں کی موجودگی ہے جن کے کامیاب حکمت عملیوں نے آج بلوچستان میں پاکستانی قبضہ کو شکست کے قریب کردیا ہے اور بلوچ تحریک آزادی کو عالمی سطع پر متارف کرایا ہے۔بی ایس او آزاد آج اسی مقصد کو آگے لیجاتے ہوئے بلوچ عوام کو منظّم کرنے کی جدوجہد کررہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:27نومبر 2012

بی ایس او کے قیام نے بلوچ قومی تحریک آزادی کو انقلابی خطوط پر گامزن کردیا۔۔ بی ایس او آزاد

کوئٹہ (پ ر) بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے پینتالیسویں یوم تاسیس پر بی ایس او آزاد کے مرکزی کال پر بلوچستان بھر میں تربیتی ورکشاپس منعقد کیئے گئے جن میں تنظیم کاری اور انقلابی جدوجہد اور قومی تحریک آزادی میں بی ایس او کے کردار کے متعلق تربیتی پروگرام ہوئے بی ایس او آزاد کے مرکزی کال پر کراچی، کوئٹہ، پنجگور، تربت، خاران، آواران، مشکے، منگوچر، مستونگ، بسیمہ، قلات، مچھ، کردگاپ، حب، گڈاپ، اتھل اور حیدرآباد میں ورکشاپ منعقد کیئے گئے ورکشاپس میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی تاریخ اور قومی تحریک آزادی میں بی ایس او کے کردار اور بی ایس آزاد کی موجودہ حالات میں جدوجہد پر روشنی ڈالی گئی پروگرام میں شرکا نے کہا کہ بلوچستان میں قومی آزادی کیلئے منظّم سیاسی جدوجہد کی بنیاد بی ایس او سے ہوئی ہے 26 نومبر بلوچ قوم کیلئے ایک تاریخی دن ہے 26 نومبر 1967 میں بی ایس او کے قیام نے بلوچ قومی تحریک کو ایک نئی سمت پر گامزن کر کے بلوچ سیاست کو ایک نئی جہت دے کر اسے انقلابی خطوط پر گامزن کردیا بی ایس او نے اپنے قیام کے دن سے لیکر آج تک مختلف مشکلات اور مصائب کا خندہ پیشانی سے سامنہ کرتے ہوئے ایک نرسری کی حیثیت سے بلوچ نوجوانوں کی فکری وشعوری بنیادوں پر تربیت کرتے ہوئے ہزاروں ایسے جانباز اور پختہ عزم انقلابی لیڈر و کارکن پیدا کیئے ہیں جو مادرِ وطن وقوم کی آزادی کیلئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرچکے ہیں زندانوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کررہے ہیں یا پھر عملی میدان میں پاکستانی سے برسرِ پیکار ہیں۔ بی ایس او نے نوجوانوں کیلئے ایک انقلابی پلیٹ فارم فرائم کیا اور بلوچ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کر کے بلوچستان میں عظیم رہنما پیدا کیئے جن کی جدوجہد اور رہنمائی نے بلوچ قوم کو پاکستانی پارلیمانی سیاست کے نام پر مفاد پرستی کے دلدل سے نکال کر انہیں قومی آزادی کا واضح مقصد دیا جس پر چل کر آج بلوچ قومی تحریک آزادی کامیابی کی جانب گامزن ہے آج بلوچ نوجوانوں کو سرکار مراعات اور پروپگنڈے سے نکال کر انہیں انقلابی نظریات سے مصلح کر کے آزادی کی جدوجہد کی جانب راغب کرنے میں بی ایس او آزاد اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں مستعدی سے میدان عمل میں سرگرم ہے اور بی ایس او کی حقیقی جدوجہد اور اس کے کردار کو تسلسل کو ساتھ جاری رکھتے ہوئے بی ایس او آزاد قومی آزادی اور پاکستانی قبضہ گیر اداروں کے خلاف عوام کو منظّم کر رہی ہے جبکہ پاکستان بی ایس او آزاد کو ختم کرنے کیلئے تمام حربے آزما رہا ہے جس دوران بی ایس او آزاد کے کردار سے خوفزدہ ہو کر پاکستان نے بی ایس او آزاد کے کئی کارکنوں کو شہید کیا ہے جن میں شہید قمبر چاکر، کامریڈ قیوم، شفیع بلوچ سمیت کئی ممبران کو شہید کیا گیا جبکہ ہماری رہنما زاکر مجید تاحال پاکستان کے اقوبت خانوں میں بند ہیں۔ پاکستان ہمیشہ سے قومی تحریک آزادی میں بی ایس او کے تاریخی کردار کو ختم کرنے کے درپے رہا ہے جس کیلئے پاکستانی گماشتہ سیاست دانوں نے بی ایس او کو قومی آزادی کی جدوجہد سے دور کرنے کیلئے ہمیشہ بی ایس او کو اپنی مفاد پرستی کے سیاست کے زیر اثر لانے کی کوشش کی ہے 1988 میں پاکستان کے گماشتے پارلیمانی پارٹیوں نے قوم پرستی کی آڑ میں بی ایس او کے انقلابی کردار کو ختم کر کے اسے اپنے ذیلی تنظیم کی حد تک محدود کر کے اسے اپنے جھنڈ لگانے اور انتخابی مہم چلانے کیلئے استعمال کیا مگر 2002 میں ڈاکٹر اللہ نذر نے بی ایس او کو سامراجی گماشتوں سے نجات دلا کر اسے اسکی حقیقی راہ پر گامزن کردیا جو بی ایس او (آزاد) کی شکل میں آج عملی میدان جدوجہد کر رہی ہے گو کہ پاکستان پارلیمانی پارٹیوں بی این پی مینگل اور نیشنل پارٹی نے بی ایس او کے مقدس نام کو استعمال کرتے ہوئے اپنے دم چھلوں کو بی ایس او کا نام دے کر انہیں میدان میں اتار دیا ہے مگر بلوچ قوم اور بلوچ نوجوان انکے کردار سے اچھی طرف واقف ہیں اور انہیں مسترد کر چکے ہیں ورکشاپ میں تنظیم کاری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا گیا کہ کسی بھی انقلابی تحریک کو منزل تک پہنچانے میں مضبوط تنظیم بنیادی کردار ادا کرتی ہے مضبوط تنظیم کے بغیر عوام میں انقلابی شعور و آگاہی پھیلانا ممکن نہیں کیونکہ تنظیم ہی وہ واحد ادارہ ہے جس کے ذریعے کارکنوں اور عوام کی ذہن سازی وتربیت کر کے انہیں انقلابی عمل کیلئے تیار کیا جاتا ہے انقلابی تنظیم کا یہ اصول ہے کہ اس کے تمام کارکن اداروں کے ماتحت ہوں اپنے ذاتی مفادات سے زیادہ تنظیمی مفادات کو ترجیح دیتے ہوں ضد، انا پرستی، حسد، لالچ سے پاک انفرادیت پر اجتماعیت کو ترجیح دیتے ہوں، باہمی احترام، تنقید اور خود تنقیدی، انقلابی اصولوں کی پابندی کر کے اور سیاسی صورتحال کے نشیب وفراز کا مطالعہ کرتے ہوئے بدلتے ہوئے وقت وحالات کے ساتھ انقلابی اور سائنسی بنیادوں پر پالیسیاں تشکیل دے کر انقلابی اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے اور مختلف ذرائع سے پروپیگنڈہ وتشہیر کے ذریعے عوام میں آگاہی پھیلا کر انقلابی شعور کو اجاگر کرنا چاہیے تاکہ انقلابی کارکن اور عام عوام باہم مل کر انقلابی عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:25نومبر2012

ایف سی نے پروم میں آپریشن تیز کردیا آبادی کو نشانہ بنایا جاریا ھے۔بی ایس او آزاد

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ پروم وگردونواح میں جاری آپریشن تیز کردیا گیا ہے گزشتہ کئی روز سے علاقے میں آپریشن جاری ہے پروم میں تسلسل کے ساتھ پاکستانی فورسز عام آبادی کے خلاف کاروائیاں کررہی ہیں ایف سی آبادی میں گھس کر عوام میں خوف وہراس پھیلانے کی کوشش کررہا ہے جبکہ چندروز سے باقائدہ بڑے پیانے پر کاروائیوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور مقامی آبادی کو برائے راست نشانہ بنایا جارہاہے پاکستانی فورسز اپنی شکست چھپانے کیلئے آبادی کو مسلسل نشانہ بنارہے ہیں جس سے علاقے میں خوف وہراس کا ماحول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ تحرک آزادی کے سامنے اپنی شکست چھپانے کیلئے عوام کو جدوجہد آزادی سے دورکرکے الیکشن جیسے گناونے حربوں کوکامیاب بنایا جاسکے ترجمان نے مزید کہا کہ حالیہ دنوں میں بلوچستان بھرمیں جاری بلوچ نسل کشی تیز کردیا گیا ہے پاکستانی گماشتہ سیاستدانوں اور زرخریدگروں کے ہمراہ ایف سی جرائم پیشہ کاروائیوں،منشیات فروشی سمیت بلوچ نسل کشی کی کاروائیوں میں مصروف ہیں جنہیں پاکستان کے تمام قبضہ گیراداروں کامکمل تعاون حاصل ہے پاکستانی فورسز کی جانب سے بلوچ نسل کشی کی کاروائیوں میں حالیہ تیزی قبضہ گیر کے خاتمہ کو چھپانے کی کوشش ہے بلوچ قومی تحریک آزادی کے سامنے پاکستانی قبضہ گیریت شکست کاشکار ہوچکی ہے جسے چھپانے کیلئے بلوچ آبادیوں کے خلاف کاروئیاں کی جارہی ہیں لیکن بلوچ عوام آزادی کیلئے جدوجہد پر پرعزم ہیں اور پاکستان کی نسل کشی کے کاروائیوں سے کسی بھی طرح زیرنہ ہوسکے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ:29نومبر2012

بلوچ فرزندوں کی شھادت اور آبادیوں پر بمباری سے تحریک آزادی کمزور نھیں کیا جاسکتا۔بی ایس او آزاد

کوئٹہ(پ ر)بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن آزاد کے ترجمان نے اپنے جاری کردہ بیان میں کہا کہ خاران میں بلوچ فرزندوں شہید اللہ رحم ساسولی اورشہید اسلم ڈگارزئی کی پاکستانی ڈیتھ اسکوڈ کے ہاتھوں شہادت اورکرموڈھ سے کوہستان مری اورگردونواح میں پاکستانی فورسز کی جانب سے بمباری کیخلاف 29نومبر کوبلوچستان بھرمیں شٹرڈاون ہڑتال کی جائیگی ترجمان نے کہا کہ پاکستانی فوج اورڈیتھ اسکواڈ کی جانب سے بلوچوں کی شہادت اورآبادیوں پر بمباری سے تحریک آزادی کمزورنہیں ہوسکتی بلوچ قوم آزادی کیلئے ہرقسم کی قربانی دینے کیلئے تیارہے پاکستان اپنی تشدداورنسل کشی کی کاروائیوں میں تیزی لانے کے باوجود بلوچ سرزمیں پراپنی شکست اوربلوچ قوم کی آزادی کونہیں روک سکتا بلوچ فرزندتحریک کو اپنی منزل قومی آزادی تک لیجانے کیلئے اپنے سروں کی قربانیوں دے رہے ہیں جن کے بدولت ہی آج پاکستانی فوج اورڈیتھ اسکوڈ کوبلوچستان میں شکست کا سامنہ ہے جسے چھپانے کیلئے آئے روز بلوچ فرزندوں کوشہید کیا جارہاہے اورآبادیوں پر بمباری کی جارہی ہے۔ ترجمان نے مزید کہا کہ گزشتہ روز سے سبی کے علاقے کرموڈھ سے پاکستانی فوج کی جانب سے کوہستان مری اورگردونواح کے علاقوں میں بمباری کی جارہی ہے جوکہ انہی علاقوں میں پہلے سے جاری بمباریوں اورفوجی کاروائیوں کاتسلسل ہے جسے اب مزید تیز کیا جارہاہے جس کا واضح مقصد تحریک آزادی کوکمزورکرنے کیلئے بلوچ قوم کی نسل کشی ہے جبکہ گزشتہ روز خاران میں بلوچ فرزندوں اللہ رحم ساسولی اوراسلم ڈگارزئی کو پاکستانی ڈیتھ اسکواڈ کے کارندوں نے شہید کردیا پاکستان اپنی فوج اورڈیتھ اسکوڈ اوراپنے گماشتوں کے زریعے بلوچ فرزندوں کوشہید کرکے بلوچ قومی تحریک کے سامنے اپنی شکست کوڈھکنا چاہتا ہے اور بلوچ عوام میں اپنے کےگماشتہ پارٹیوں نیشنل پارٹی،بی این پی مینگل اوربی این پی عوامی کے ذریعے الیکشن ممکن بنانے کی کوشش کررہاہے لیکن بلوچ فرزندوں نے اپنے سروں کی قربانیاں دے کرہی تحریک آزادی کواس مقام تک پہنچایا ہے اور ہزاروں بلوچ فرزند میدان عمل میں جدوجہداورشہدا کی قربانیوں کوسرزمین کی آزادی تک لیجانے کیلئے میدان میں موجود ہیں بلوچ فرزندوں کی شہادت کوتاریخ میں یادرکھا جائیگا اوران کی قربانیوں کے تسلسل کوجاری رکھتے ہوئے بلوچ فرزند جدوجہد کرتے رہینگے بلوچ عوام 29نومبر کو بلوچستان بھرمیں شٹرڈاون ہرتال کامیاب بناکرآزادی کی تحریک سے وابستگی کاثبوت دیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆